

احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی سیاسی، سماجی اور مذہبی جہات کا مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

محمد رضا



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۱۹ء

احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی سیاسی، سماجی اور مذہبی جہات کا مطالعہ

مقالہ نگار:

محمد رضا

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۱۹ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی سیاسی، سماجی اور مذہبی جہات کا مطالعہ

رجسٹریشن نمبر: 1318/M/US17

پیش کار: محمد رضا

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر عابد حسین سیال

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریکنگڈیر محمد ابراہیم

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ:

اقرار نامہ

میں محمد رضا حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویج، اسلام آباد کے ایم۔ فل اسکالرشپ کی حیثیت سے ڈاکٹر عابد سیال کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

محمد رضا

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویج، اسلام آباد

فہرست ابواب

صفحہ نمبر	عنوان
ii	مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم
iii	اقرارنامہ
iv	فہرست ابواب
vii	Abstract
viii	اظہار تشکر
1	باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث
1	الف۔ تمہید
1	i. موضوع کا تعارف
1	ii. بیان مسئلہ
2	iii. مقاصد تحقیق
2	iv. تحقیقی سوالات
2	v. نظری دائرہ کار
2	vi. تحقیقی طریقہ کار
3	vii. مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق
3	viii. تحدید
3	ix. پس منظری مطالعہ
3	x. تحقیق کی اہمیت
4	ب۔ احمد فراز: اجمالی تعارف
11	ج۔ مزاحمت بطور سماجی عمل
13	د۔ مزاحمت کی جہات
13	i. مزاحمت کی سیاسی جہت

13	.ii مزاحمت کی سماجی جہت
14	.iii مزاحمت کی مذہبی جہت
14	ہ۔ عالمی ادب میں مزاحمت کی روایت
14	.i انگریزی ادب میں مزاحمتی پہلو
15	.ii عربی ادب میں مزاحمتی پہلو
16	.iii فارسی ادب میں مزاحمتی پہلو
18	.iv اُردو ادب میں مزاحمت کی روایت
21	حوالہ جات
24	باب دوم: احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی سیاسی جہت
24	الف۔ سیاست کے مفہوم و معانی
25	ب۔ تیسری دُنیا کے بارے میں ترقی یافتہ ممالک کے رویے
27	ج۔ مقامی سیاست پر عالمی سیاست کے اثرات
30	د۔ عالمی سیاست کے خلاف مزاحمت
44	ہ۔ نظریہ جمہوریت اور آمریت کی ابتدا
46	و۔ آمریت کی ابتدا
46	ز۔ آمریت کے خلاف مزاحمت
50	.i پہلے مارشل لا کے خلاف مزاحمت
55	.ii دوسرے مارشل لا کے خلاف مزاحمت
63	.iii تیسرے مارشل لا کے خلاف مزاحمت
82	.iv مشرف دور کے خلاف مزاحمت
84	ح۔ مقامی سیاست کے خلاف مزاحمت
96	حوالہ جات

101	باب سوم: احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی سماجی جہت
103	الف۔ احمد فراز کی وطن دوستی، ملک سے محبت
105	ب۔ معاشی پالیسی اور پالیسی سازوں کے خلاف مزاحمت
117	ج۔ انسانی رویوں کے خلاف مزاحمت
124	د۔ عام لوگوں کی خاموشی اور رویے کے خلاف مزاحمت
126	ہ۔ قبائلی روایات سے اختلاف
130	و۔ نا انصافی کے خلاف مزاحمت
133	ز۔ صنفی امتیازات کے خلاف مزاحمت
138	حوالہ جات

140	باب چہارم: احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی مذہبی جہت
140	الف۔ مذہب و مسلک اور فقہی اختلافات کی بنا پر انتہا پسندانہ رویہ
142	ب۔ احمد فراز کی مذہبی شاعری
148	ج۔ مذہبی طبقے کی طرف سے احمد فراز پر کفر و الحاد کا الزام
150	د۔ مذہبی فکر، غلط تعبیر کے خلاف مزاحمت
156	ہ۔ مذہبی اجارہ دار طبقے کے استحصالی رویوں کے خلاف مزاحمت
163	و۔ شعری روایات میں مذہبی کرداروں کے بارے میں رویے
166	ز۔ احمد فراز کی شاعری میں شعری روایات کی عکاسی
169	حوالہ جات

171	باب پنجم: ماحصل
171	الف۔ مجموعی جائزہ
180	ب۔ نتائج
181	ج۔ سفارشات
182	کتابیات:

Abstract

Title:

Political, Social and Religious Dimensions of Resistance in Ahmed Faraz's Poetry

Abstract:

Ahmed Faraz is one of the prominent poets of Urdu who are known for their resistance poetry. He expressed his views with bold stance. He has various dimensions of resistance such as political, social and religious. He raised his voice in favor of oppressed class of society and against the exploiting forces. This thesis is an analytical study of Ahmed Faraz's poetry in the above context.

Thesis comprises of four chapters:

In the first chapter introduction of theme and key terms of the study, its scope, objectives, background and research questions are presented. Second part of this chapter presents a brief introduction of Ahmed Faraz and his works. Various dimensions of resistance and a short review of resistance in world literatures is given in the later parts.

Second chapter is about the political dimension of resistance in Ahmed Faraz's poetry. Global and local political situation and conflicts and the stance of the poet is discussed with examples.

In third chapter social dimension of resistance is discussed whereas in fourth chapter religious dimension of resistance is analyzed. Fifth chapter includes overall review and findings of the study and recommendation of the researcher.

اظہارِ تشکر

میں سب سے پہلے خالق کائنات کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس ذاتِ اقدس نے عدم سے وجود میں لانے کے بعد تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی توفیق عنایت فرمائی۔ شعبہ اردو نمل کی صدر اور تمام اساتذہ کا سپاس گزار ہوں جن کی رہنمائی، حوصلہ افزائی اور شفقت میرے لیے مشعلِ راہ بنی۔ میں اپنے شفیق استاد ڈاکٹر عابد حسین سیال جو کہ خوش قسمتی سے میرے اس مقالے کے نگران بھی ہیں کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔ انہوں نے ہر وقت اور خاص طور پر دورانِ تحقیق حوصلہ اور ہمت بڑھاتے ہوئے نہایت شفقت کے ساتھ رہنمائی کی۔ تعلیمی مراکز سے دور ہونے کے باوجود جن اداروں نے علمی مراکز سے رشتہ جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا ان میں جامعۃ الکوثر ہے میں اس ادارے اور استاد العلماء علامہ شیخ محسن علی نجفی کا احسان مند ہوں۔ جنہوں نے تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔ میرے تعلیمی سفر میں سب سے اہم کردار دنیا میں موجود میرے واحد سہارے میری ماں کا رہا ہے جنہوں نے اس عمر میں بھی تمام صعوبتوں اور ذمہ داریوں کو خود نبھاتے ہوئے ہر لمحہ مجھے حوصلہ اور ہمت دی اور اس ہستی نے مجھے آج تک والد مرحوم کی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ میں اپنی ماں کے احسانات کا مقروض ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ میں اپنی بہنوں کی خدمات کا قدر دان ہوں۔

اسی تعلیمی سفر کے دوران خوش قسمتی سے جن علم دوست احباب سے علمی بحث و مباحثہ کرتے ہوئے ان سے بھی سیکھنے کا موقع ملا ان میں عائشہ واجد، سدرہ طاہر اور خصوصاً شیماسعدیہ ہیں۔ ان سب کا شکریہ ادا کرنا میری اخلاقی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ میں ان احباب کو جنہوں نے کتابوں، علمی مواد کی رہنمائی اور لائبریریوں تک رسائی حاصل کرنے میں معاونت کی؛ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

محمد رضا

باب اوّل:

موضوع تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i. موضوع کا تعارف:

احمد فراز ۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء کو نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام سید احمد شاہ تھا بعد میں وہ احمد فراز کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے ۲۵ اگست ۲۰۰۸ء میں وفات پائی۔ احمد فراز نے ترقی پسند اندازِ فکر اپنایا اور اپنی شاعری میں محکوم و مظلوم طبقوں کی حمایت اور نمائندگی کی۔ ان کی شاعری میں رومانوی رنگ کے ساتھ ساتھ مزاحمت کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی کئی جہات ہیں جن میں سماجی، سیاسی اور مذہبی پہلو شامل ہیں۔ انھوں نے عالمی سیاسی صورتِ حال کے خلاف بھی قلم اٹھایا، دنیا کی مظلوم اقوام کی جدوجہد میں شریک رہے اور انسانی حقوق اور احترامِ انسانیت کے لیے آواز بلند کرتے رہے جس کی پاداش میں ان کو قید و بند اور جلا وطنی کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں، تاہم وہ کبھی اپنے موقف سے دست بردار نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری میں سماج میں پائے جانے والی معاشی اور طبقاتی ناہمواریوں، تہذیب دشمن قوتوں اور نامعقول رویوں پر تنقید موجود ہے۔ مزاحمت کا یہ پہلو ان کی شاعری میں تسلسل کے ساتھ آیا ہے اور ان کی یہ روش آخر دم تک جاری رہی۔ زیرِ نظر تحقیق احمد فراز کی شاعری کے اسی پہلو کے سہ جہتی مطالعے پر مشتمل ہے۔

ii. بیان مسئلہ:

احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی کئی جہات ہیں۔ ان میں ملکی و عالمی سیاسی صورتِ حال، افریقہ کے انسانوں کا قتل عام کرنے والی قوتیں، انسانی حقوق پامال کر کے اہل قلم کو حرفِ حق کہنے سے روکنے والی مقتدر قوتیں، مذہبی طبقے کے نامعقول رویے، سماجی، سیاسی اور مذہبی طبقے کی ناروا اجارہ داری کی جہات نمایاں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان جہات میں مزاحمت کی نوعیت، اہمیت اور امتیاز کیا ہے؟

iii. مقاصد تحقیق:

- ۱۔ احمد فراز کے شعری افکار میں مزاحمت کے عناصر کی تلاش و جستجو کرنا۔
- ۲۔ احمد فراز کی شاعری میں موجود مزاحمت کی سماجی، سیاسی اور مذہبی جہات کا مطالعہ کر کے اُن امتیازات کو اُجاگر کرنا۔

iv. تحقیقی سوالات:

- ۱۔ احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی سیاسی، سماجی اور مذہبی جہات کی نوعیت کیا ہے؟
 - ۲۔ احمد فراز کی شاعری کی فکری کائنات میں مزاحمت کی کارفرمائی اور اس کے اثرات کیا ہیں؟
۷. نظری دائرہ کار:

ادب اور مزاحمت کا تعلق دیرینہ ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ادب بنیادی طور پر ہوتا ہی مزاحمتی ہے۔ فرد جس سماج میں موجود ہوتا ہے، ان کے ناہموار اور ناپسندیدہ رویوں کے خلاف مزاحمتی سوچ رکھتا ہے۔ شاعر افرادِ معاشرہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ان کی آواز بنتا ہے اور ادب میں مزاحمت کا زاویہ پیدا ہوتا ہے۔ فراز کی شاعری میں مزاحمت سیاسی ناہمواری کے خلاف بھی ہے، سماجی ناانصافی کے خلاف بھی اور مذہبی اجارہ دار طبقے کے ہاتھوں افرادِ معاشرہ کے استحصال کے خلاف بھی۔ ان تینوں جہات کو فکری اور سماجی تناظر میں زیرِ بحث لایا گیا اور اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

vi. تحقیقی طریقہ کار:

زیرِ نظر تحقیق کا موضوع ’احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی سیاسی، سماجی اور مذہبی جہات کا مطالعہ‘ ہے، لہذا موضوع سے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، ترتیب اور مطالعہ و تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس میں تاریخی تحقیق اور تجزیاتی مطالعہ زیادہ معاون و مفید طریقہ کار ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں ضرورت کے پیشِ نظر مزید کسی تحقیقی طریقوں کو بھی اختیار کیا گیا ہے۔ بنیادی ماخذات میں احمد فراز کی کتابیں، کلیات جبکہ ثانوی ماخذات میں دورانِ تحقیق احمد فراز سے متعلق چھپنے والے مضامین، کتب اور رسائل کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ موضوع سے مربوط مواد تک رسائی کے لیے مختلف لائبریریوں سے رجوع کرنے کے علاوہ انٹرنیٹ اور دیگر ماخذات سے بھی حسبِ ضرورت استفادہ کیا گیا ہے۔

vii. مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

احمد فراز کی شخصیت اور فن پر جامعہ ملیہ اسلامیہ بھارت میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ احمد فراز کی غزل کے حوالے سے بہاولپور یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ احمد فراز کی شاعری میں سیاسی مزاحمت کے حوالے سے پشاور یونیورسٹی میں تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ زیرِ نظر تحقیق کا مقصد احمد فراز کی شاعری میں موجود مزاحمت کی سیاسی، سماجی اور مذہبی جہات کا مطالعہ کرنا ہے جس پر تاحال کام نہیں ہوا۔

viii. تحدید:

زیرِ نظر تحقیق احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی تین جہات یعنی سیاسی، سماجی اور مذہبی مزاحمتی عناصر کے مطالعے اور تجزیے پر مشتمل ہے۔ یہ تحقیق فراز کی مطبوعہ شعری کتابوں تک محدود ہے۔ احمد فراز کی شاعری کے دیگر فکری ابعاد، ان کی شاعری کے فنی حوالے اور ان کی غیر مطبوعہ شاعری مقالے کی حدود سے باہر ہیں۔

ix. پس منظری مطالعہ:

احمد فراز کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر ان کی شخصیت اور شاعری کے مختلف گوشوں پر تحقیق و تنقید ہوئی ہے۔ فراز پر فتح محمد ملک کی ایک مستقل کتاب، فراز کے شعری مجموعے، سہ ماہی "ادبیات" اسلام آباد، ماہنامہ "کتاب" اسلام آباد اور "ماہِ نور" لاہور کے احمد فراز نمبر اس ضمن میں خصوصی حوالے کے کام ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد ناقدین نے اپنی کتابوں میں فراز پر مضامین لکھے ہیں اور اردو شاعری کے تذکروں میں احمد فراز کے حوالے سے آراء اور تجزیے موجود ہیں۔ اس سارے کام سے ممکنہ حد تک استفادہ کیا گیا ہے۔

x. تحقیق کی اہمیت:

احمد فراز معاصر شعری افق کی ان نمایاں ترین شخصیات میں سے ہیں جن کے فکر اور فن کو عوام و خواص میں پذیرائی حاصل رہی۔ ان کی شاعری سچ اور تلخ حقائق پر مبنی شاعری ہے۔ اس کی واضح دلیل ان کی غزلوں اور نظموں میں شدید مزاحمت کی موجودگی ہے۔ چنانچہ اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کی شاعری کی تفہیم کو جامع اور ہمہ جہت بنانے کے لیے اس پر مختلف زاویوں سے تنقیدی و تحقیقی کام کیا جائے۔ اس تناظر میں

فراز کی شاعری میں مزاحمت کے عناصر کی تلاش اور ان کا تجزیہ نہ صرف فراز کی شاعری کے ایک اہم رخ کی تفہیم میں معاون ہو گا بلکہ ان کے عہد کی شاعری کے مجموعی مزاحمتی رویے کو سمجھنے میں بھی مدد دے گا۔

ب۔ احمد فراز: اجمالی تعارف

رومانیت اور مزاحمت کی دنیا آباد کرتے ہوئے اُردو شعری ادب کی دنیا میں شہرت پانے والے احمد فراز کا تعلق نوشہرہ پشاور سے تھا۔ ان کا اصل نام سید احمد شاہ تھا انہوں نے پہلے گوہر سرحدی اور شرر برقی کے نام سے لکھا۔ بعد میں دوستوں کے طنز و مزاح پر شرر برقی نام ترک کر کے فراز کے نام سے لکھنا شروع کر دیا، ان کی زندگی کافی نشیب و فراز سے گزری پھر بھی فراز کے نام سے مشہور ہوئے اور ادبی منظر نامے پر احمد فراز کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ سید احمد شاہ، سید محمد شاہ برق کے دوسرے بیٹے تھے۔ احمد فراز جنوری ۱۹۳۱ء کو نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کوہاٹ میں حاصل کی اور کوہاٹ اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایڈورڈ کالج پشاور سے گریجویشن مکمل کی اور پشاور یونیورسٹی سے ایم اے اُردو اور فارسی کی ڈگری حاصل کی۔

احمد فراز نے ہوش سنبھالا تو ان کو ادبی ماحول میسر آیا۔ ان کے والد آغا برق کوہاٹی اُردو اور فارسی زبان کے عالم و شاعر تھے۔ اُن کے ہاں مشاعرہ اور ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ احمد فراز کی عملی زندگی کا آغاز اُس وقت ہوا جب ان کی ملاقات کالج میں حصول تعلیم کے دوران زیڈ اے بخاری سے ہوئی۔ انہوں نے احمد فراز کو ریڈیو پر کام کرنے کے لیے دعوت دی۔ احمد فراز ریڈیو کراچی سے منسلک ہوئے اور اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔ انہوں نے اظہارِ بیان کے لیے اُردو زبان کا انتخاب کیا اور اس میں محنت کرنے لگے۔ ان کی زبان و ادب میں نکھار اُس وقت آیا جب ان کو شاہد دہلوی، ارم لکھنوی اور چراغ حسن حسرت جیسی بلند پایہ ادیبوں کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا، انہوں نے ان بلند پایہ ادیبوں سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کیے بغیر ریڈیو پاکستان کراچی سے منسلک ہو گئے تھے۔ اس لیے کراچی چھوڑ کر دوبارہ پشاور کالج میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے جانے لگے۔ زمیندار کالج گجرات میں اپنے کالج کی نمائندگی کرتے ہوئے مشاعرے میں شرکت کرنے کا موقع ملا اور وہاں ان کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ پشاور یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد اسلامیہ کالج میں لیکچرر تعینات ہوئے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۱ء تک درس و تدریس سے وابستہ رہے لیکن کچھ وجوہات اور خدشات کی بنا پر یہ نوکری چھوڑ کر پاکستان نیشنل سنٹر میں بطور ڈائریکٹر کام کرنے لگے۔ ۱۹۷۶ء میں

ذوالفقار علی بھٹو نے اکیڈمی آف لیٹرز کی بنیاد رکھی تو احمد فراز کو پہلا ڈائریکٹر جنرل بنادیا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کر دیا اور حالات سازگار نہ رہے اور ان کو مجبوراً جلا وطنی اختیار کرنی پڑی۔ ضیاء الحق کے دورِ حکومت کے بعد ملک واپس آئے اور ۱۹۸۹ء میں اکادمی ادبیات کے چیئرمین بنے اس کے بعد لوک ورثہ اسلام آباد میں چیف ایگزیکٹو کے عہدے پر ۱۹۹۳ء تک کام کیا اور ۱۹۹۴ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے ۲۰۰۵ء میں سبکدوش ہو گئے۔

احمد فراز کی شدید خواہش یہ تھی کہ جہاز کا پائلٹ بن کر فضاؤں میں محو پرواز رہیں۔ انہوں نے تمام امتحانی مراحل بھی مکمل کر لیے جب ان کا نو مینیشن لیٹر آیا تو والدہ نے سختی سے منع کر دیا۔ انہوں نے والدہ کے کہنے پر اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ پائلٹ بن کر فضاؤں میں پرواز تو نہ کر سکے لیکن اپنے ملک اور بیرون ملک فضاؤں میں ان کی آواز ضرور گونجتی رہی۔ ان کی اس خواہش کی شدت کا اندازہ لاشعوری طور پر ان کے بعض تجزیوں اور باتوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔

بیت بازی سے نا آشنا احمد فراز، نویں جماعت کے دوران اپنے ہم جماعت اور ہم خیال طلبہ سے گفتگو کے دوران نہ صرف بیت بازی سے آشنا ہوئے بلکہ سبقت حاصل کرنے کے لیے الفاظ سے کھیلنے لگے اور شعر لکھنے اور کہنے کا عزم کر لیا۔ ان کا پہلا شعر یہ ہے:

رات کو ایک خواب دیکھا تھا
جس میں تیرا شباب دیکھا تھا

جس طرح ان کی بیت بازی اور شعر گوئی کی ابتدا انوکھی ہے اسی طرح شروع شروع میں کوہاٹ میں ان کا فرمائشی غزل و شعر سنانے کا انداز بھی نرالا تھا۔ ان کی ڈائری مقفل ہوتی تھی فرمائشی شعر سنانے کے لیے چابی کے ذریعے ڈائری کھولتے ہوئے شعر سناتے تھے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ فراز کو اپنی ڈائری مقفل کرنے کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ ایک نظم لکھنے کی پاداش میں خود مقفل و مجبوس ہو گئے اور ان کی اس نظم پر ایسی پابندی لگ گئی کہ وہ نظم ابھی تک ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔

احمد فراز کی شاعری میں احتجاجی لہجہ ابتدا ہی سے تھا جب ان کے والد آغا برق کو ہائی نے اپنے بچوں کے لیے کپڑے لائے تو انہوں نے احتجاج کرتے ہوئے پہلا شعر لکھا تھا:

جب کہ سب کے واسطے لائے ہیں کپڑے سیل سے
 لائے ہیں میرے لیے قیدی کا کمبل جیل سے

انہوں نے قلم کی حرمت پر کبھی بھی سودا بازی نہیں کی۔ وہ مصلحت پسندوں، درباری فکر رکھنے
 اور عوام کو گمراہ کرنے والے بے ضمیروں سے ہمیشہ دُور رہے۔ ان کے مزاحمتی رویے، فکر اور عزم کے بارے
 میں ڈاکٹر عابد حسین سیال لکھتے ہیں:

"فراز کا تعلق شاعری کے اس مکتب سے ہے جو انسانیت کی سماجی، معاشی اور سیاسی ترقی
 کی سوچ پر قد غن لگانے والی قوتوں کے خاتمے پر یقین رکھتا ہے۔۔۔ یہ ایک خوش کن
 احساس ہے کہ احمد فراز نے ایک مخلص اور رومانوی شاعری سے احتجاجی اور مزاحمتی
 شاعری تک کا سفر کرتے ہوئے قارئین کے ایک وسیع حلقے کو متاثر کیا۔ ہمارا ملک ایک
 کے بعد ایک آمریت کی زد میں آتا رہا۔ فراز بھی مجاز لکھنوی کی طرح یہ سمجھتا تھا کہ
 جب عوامی مزاحمت کا نفاذہ بجے تو محبوبہ کے سر پر مخلصین دوپٹے کی جگہ احتجاجی پرچم
 ہو" (۱)

ان کی شہرت کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ ان کو ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں شہرت ملی لیکن
 حقیقت میں ایسا نہیں ہے وہ آمر کے دورِ حکومت سے پہلے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ملک کے ممتاز ادیب و
 شاعر افتخار عارف ان کی شہرت کے بارے میں اس طرح گویا ہیں:

"احمد فراز کو ضیاء الحق دور سے پہلے شہرت ملی تھی ایسا نہیں ہے کہ ضیاء کے دور میں ان کو
 شہرت ملی ہو۔" (۲)

کشور ناہید نے بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۵ء کے درمیان ان کو شہرت
 ملی تھی" (۳)۔ انہوں نے جب نظم "پیشہ ور قاتلو" لکھی تو ان کو گرفتار کر کے قید میں رکھا گیا، اس کے بعد
 کراچی کے ایک مشاعرہ میں انہوں نے اپنی مشہور زمانہ نظم "محاصرہ" سنائی تو ان کو صوبہ بدری کا پروانہ تھما دیا
 گیا۔ ملک میں ان پر اپنی رائے کا اظہار کرنے اور اپنے جذبات و احساسات کو بیان کرنے کے تمام وسائل و ذرائع
 مسدود ہو گئے۔ اس پر دل برداشتہ ہو کر احمد فراز خود ساختہ جلا وطنی اختیار کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

ملکی تاریخ کے تمام ادوار حکومت میں سے ضیا کا دورِ حکومت سخت ترین دور تھا۔ اس دورِ آمریت میں اظہار و بیان پر پابندی لگائی گئی تھی، آمریت کی مخالفت کرنے والوں کو سرِ عام کوڑے مارے جاتے تھے۔ اس دور میں زبان و قلم پر لگائی گئی۔ پابندی کے بارے میں صائمہ نورین بخاری لکھتی ہیں:

"۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک جب اظہار بڑا مشکل تھا، ہر سوچ پر آمریت کے پہرے تھے۔ زندگی کے کینوس پر گھٹن کی فضا تخلیق کر دی گئی تھی۔ جمہوری فکر، آمرانہ رویوں اور عامیانہ سوچوں کی قید میں جکڑی ہوئی تھی۔۔۔ مگر فراز نے جمہوریت، حریت اور اس کی علامت، مزاحمت کو زندہ رکھا۔" (۴)

احمد فراز نے ملک کے آئین و قانون اور اقتدار کو ہاتھ میں لینے والوں کے خلاف کھل کر بات کی ہے۔ جب انھوں نے چور دروازے سے آکر ملک کا مالک و حکمران بننے والی آمریت کی مخالفت کی تو ان کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے بھی اسی نکتے کی طرف اشارہ کر کے کہا ہے کہ "احمد فراز کو اپنے سیاسی نظریات پر پابند رہنے اور جذبہ حریت کی پرورش کرنے کی پاداش میں پاکستانی حکومت نے سلاخوں کے پیچھے ڈالا۔" (۵)

احمد فراز بنیادی طور پر رومانوی شاعر تھے ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ رومانیت پر مشتمل ہے۔ انھوں نے لب و رخسار اور زلفِ دراز کی تعریف و توصیف بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ ان کی شاعری میں مزاحمت کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ عقل و شعور کے مراحل طے کرتے ہوئے ملک کی سیاسی، سماجی اور مذہبی فضا میں ظلم و جبر کا موہوم سایہ دراز ہونے لگا تو ان کی مزاحمتی شاعری میں شدت آگئی۔ مزاحمتی شاعری کا دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ ترقی پسند مصنفین سے وابستہ رہے، پشاور میں صوبائی سطح پر فارغ بخاری سیکریٹری تھے تو کوہاٹ میں وہ سیکریٹری کی ذمہ داری نبھاتے رہے۔ ان کی شاعری میں مزاحمتی عناصر کے اضافہ کی تیسری اہم وجہ احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض کی صحبت تھی۔ وہ فیض احمد فیض سے بہت زیادہ متاثر تھے، ان کا کہنا تھا کہ فیض احمد فیض سے ہماری قربت بھی رہی اور ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ احمد فراز کی جبر، استحصال اور مذہبی جنونیت وغیرہ کے خلاف سخت نفرت اور احتجاج کرنے کے بارے میں نزہت عباسی لکھتے ہیں:

"احمد فراز کی شاعری کا آغاز ایک پر آشوب دور میں ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک، برصغیر کی تقسیم قیام پاکستان کے بعد کے حالات، جمہوریت کی پامالی، مارشل لا کا نفاذ، انسانی حقوق کی خلاف ورزی، معاشی عدم مساوات، طبقاتی کشمکش، مذہبی منافرت وغیرہ شروع سے لے کر اختتام تک کار فرما ہا انہوں نے قلم کو ہتھیار بنایا اور اس کی کاٹ سے سنگین دلوں میں اتر گئے۔" (۶)

احمد فراز کی پسندیدہ شخصیات میں شیکسپیر، موبساں اور نیلسن منڈیلا وغیرہ شامل ہیں۔ وہ آمریت کے خلاف آواز اٹھانے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مظلوم و مقہور طبقوں کی حمایت کرتے رہے۔ ان کی شاعری میں جابجا سماجی سطح پر کیے جانے والے ناروا سلوک کے خلاف احتجاج پایا جاتا ہے۔ وہ مظلوم اور استحصال کی چکی میں پسے والے لوگوں کی ایسی توانا آواز بن کر ظالموں کے خلاف آواز بلند کرتے تھے جس کو سُن کر غریب طبقے کو کچھ اُمید اور حوصلہ مل جاتا تھا۔ ضمیر جعفری اس نکتے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کی کتابوں کے مطالعہ سے نچلے معاشرتی طبقے کے آدمی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ فراز اس کے لیے اونچے طبقے میں جگہ خالی کروا رہا ہے۔" (۷)

ان کی شاعری کی سچائی اور حقیقت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر وقار رضوی یوں رقمطراز ہیں:

فراز کی شاعری میں سچائی اور انفرادی احساس تنہائی ہے لیکن تنہائی شاعر کی ذات کا المیہ نہیں اور نہ ذات کی نوحہ گری۔ ہر ریاکار اور بے ضمیر معاشرے میں انسان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے اس لحاظ سے ان کی تنہائی ادب میں حقیقی زندگی برتنے کا نام ہے۔۔۔ فراز ایک باشعور حساس شاعر ہیں انہوں نے اپنے زمانے کے دکھ اور کرب کو غزل میں پیش کیا" (۸)

احمد فراز کی شخصیت و فن پر کئی تحقیقی مقالہ لکھے گئے ہیں۔ احمد فراز کی غزل کے موضوع پر جامعہ ملیہ انڈیا میں پی ایچ ڈی کی سطح پر مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ احمد فراز فن و شخصیت کے عنوان سے اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور میں مقالہ لکھا گیا ہے۔ ان کو ملکی اور غیر ملکی سطح پر بہت سے اعزازات ملے ہیں جیسے آدم جی ایوارڈ وغیرہ۔ ملک کے مشہور تعلیمی مرکز جامعہ کراچی نے ان کو ادبی خدمات کے صلے میں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ ۲۰۰۴ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے ہلال امتیاز دیا گیا لیکن حکومت سے اختلاف بڑھنے کی وجہ سے ۲۰۰۶ء میں انہوں نے اعزاز احتجاجاً واپس کر دیا۔ فیض احمد فیض اور حبیب جالب کے بعد ظالم حکمرانوں کے

خلاف اُٹھنے والی توانا آواز ۲۵ اگست ۲۰۰۸ء کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ احمد فراز کی شعری تصانیف کی تفصیل درج ذیل ہیں:

شعری تصانیف:

- ۱۔ تنہا تنہا، ۱۹۵۸ء پاکستان،
- ۲۔ درد آشوب، ۱۹۶۶ء پاکستان
- ۳۔ نیا فت، ۱۹۷۰ء پاکستان
- ۴۔ شب خون، ۱۹۷۱ء پاکستان
- ۵۔ میرے خواب ریزہ ریزہ ۱۹۷۲ء پاکستان
- ۶۔ جاناں جاناں، ۱۹۷۶ء پاکستان
- ۷۔ بے آواز گلی کوچوں میں، ۱۹۸۲ء لندن
- ۸۔ نابینا شہر میں آئینہ، ۱۹۸۴ء کنیڈا
- ۹۔ سب آوازیں میری ہیں، ۱۹۸۵ء سویڈن
- ۱۰۔ پس انداز موسم، ۱۹۸۹ء پاکستان
- ۱۱۔ بودلک، ۱۹۹۴ء پاکستان
- ۱۲۔ خوابِ گل پریشان ہے، ۱۹۹۴ء پاکستان
- ۱۳۔ غزل بہانہ کروں، ۱۹۹۹ء پاکستان
- ۱۴۔ (شہر سخن آراستہ ہے، (کلیات)، ۲۰۰۴
- ۱۵۔ اے عشق جنون پیشہ ۲۰۰۷ء پاکستان

ادب کسی معاشرے کی خوبی اور خامیوں کا آئینہ اور عکاس ہوتا ہے۔ ادب انسانی زندگی اور معاشرے کو متاثر کر سکتا ہے۔ اگر کہیں مزاحمت اور ادب یکجا ہو جائے تو انقلاب آسکتا ہے۔ احمد فراز کی شاعری میں موجود مزاحمتی عناصر کے بارے میں بیان کرنے سے پہلے ”مزاحمت“ کے لغوی اور اصطلاحی معنی کی وضاحت کرنا مناسب ہو گا۔

لغوی اور اصطلاحی اعتبار سے مزاحمت کے معانی

مہذب لکھنؤی مزاحمت کے معانی اس طرح لکھتے ہیں:

”مزاحمت (بضم اول و فتح چہارم پنجم) روک ٹوک، ممانعت، تعرض، عربی مونث تعلیم یافتہ طبقے کی زبان۔“^(۹)

مولوی سید احمد دہلوی مزاحمت کے معانی اس طرح تحریر کرتے ہیں:

”مزاحمت، ع۔ اسم مونث، روک۔ تعرض۔ انکاو۔ ممانعت۔ روک ٹوک۔“^(۱۰)

عربی زبان میں مزاحمت کے لیے مقاومت کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ صاحب مصباح اللغات اس لفظ کے معنی اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"قاومہ قواماً و مقاومتاً: ساتھ کھڑا ہونا، مخالفت کرنا، قائم مقام ہونا" (۱۱)

اصطلاح میں مزاحمت کسی معاشرے یا سماج میں سماجی، سیاسی اور مذہبی عمل کے غیر مناسب اور غیر فطری رویوں کے خلاف ردِ عمل ہے۔ ہر زبان میں مزاحمت کی اصطلاح موجود ہے جیسے انگریزی زبان و ادب میں Resistance جبکہ عربی زبان میں مقاومت استعمال ہوتا ہے۔

مزاحمت بنیادی طور پر عربی زبان کا لفظ ہے اس کی اصل اور بنیاد مزاحم ہے۔ مزاحم کے معنی ہیں "خلل ڈالنا، رخنہ اندازی کرنا اور راہ کا مسدود کر دینا۔ ادب بنیادی طور پر مزاحمت پر مشتمل ہوتا ہے۔ اہل قلم و اہل دانش معاشرے کے ذمہ دار شخص ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت حساس طبع کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے کی ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور کہیں پر غیر مناسب رسم و روایت یا آئین شکنی وغیرہ نظر آئے تو معاشرے کی فلاح و بہبود اور عام عوام کی خوشحالی اور ترقی کی خاطر قلم کو جنبش دے کر ان عناصر کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ ایک حساس، باشعور اور باضمیر انسان کا معاشرے میں جبر و استحصال کرنے والے عناصر کے خلاف بغاوت کرنے کا نام مزاحمت ہے۔ نعیم بیگ مزاحمت کی حقیقت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مزاحمت در حقیقت ان آزاد سماجی و ثقافتی رویوں کے جبری استحصال سے انکار کا نام ہے جو سیاسی و عمرانی دباؤ کے تحت انسانی زندگی میں در آتا ہے۔ ایسے جبری برتاؤ اور دستور کو جب ایک ادیب و شاعر اپنے الفاظ میں ایک جدوجہد کا نام دیتا ہے تو اسے ہم مزاحمتی ادب کی شرح میں قبولیت بخشتے ہیں۔" (۱۲)

اہل قلم و اہل دانش کا انسانیت دشمن عناصر اور ظالم حکمرانوں کے خلاف قلم و کاغذ اٹھانا ہی مزاحمتی عمل ہے۔ ابرار احمد اپنے مضمون "مزاحمتی ادب" میں لکھتے ہیں:

"ادب تخلیق کرنا، بذاتِ خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیونکہ ادیب اپنے گرد و پیش سے CONFORM نہیں کر پاتا اور اس کشمکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔ اس طرح سے سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب باغی۔" (۱۳)

معاشرے میں پائے جانے والے نظام کے نشیب و فراز وغیرہ سے ادب تخلیق ہوتا ہے۔ مزاحمت کی تاریخ وابتدا کے بارے میں بعض کا خیال ہے کہ مزاحمت کی تاریخ بھی اتنی پرانی ہے جتنی جبر کی۔ جب جب

معاشرہ جبر اور ظلم و بربریت کا شکار ہوتا رہے گا تب تب باضمیر ادیب اس ظلم و بربریت کے خلاف آواز اٹھاتا رہے گا۔

ج۔ مزاحمت بطور سماجی عمل

انسان ایک سماجی جانور ہے۔ وہ اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ الگ اور تنہا زندگی گزارنا انسان کے لیے ناممکن ہے۔ انسان فطری طور پر آزاد اور خود مختار ہونے کے ساتھ ساتھ عقل و شعور کی دولت سے مالا مال ہے۔ جب انسان عقل و منطق کو چھوڑ کر عملی زندگی میں مصروف ہونے لگتا ہے تو سماج میں مختلف روئے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ انسان کے مفادات کا جب آپس میں ٹکراؤ ہونے لگتا ہے تو مخالفت و مزاحمت کا آغاز ہوتا ہے۔ اول تو انسان کو مزاحمت کا سامنا اور مقابلہ اپنی ذات سے ہی کرنا پڑتا ہے۔ یہ مزاحمت ذات سے انفرادی زندگی پھر اجتماعی اور معاشرتی سطح تک پہنچ جاتی ہے۔ معاشرے میں لوگوں کے غیر مناسب روئے اور غیر مہذب عمل سے اختلاف کرنے کے بارے میں ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں کہ

"انسان کی فطرت ہے کہ وہ ظلم و استحصال کو ایک خاص حد تک برداشت کرتا ہے اور جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو وہ اس نظام، روایت اور قدروں سے بغاوت کرتا ہے جو کہ اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔" (۱۴)

وسعتِ قلب و نظر رکھنے والے ادیبوں کا مزاحمتی ادب تخلیق کرنے کا مقصد مہذب معاشرے کی تشکیل کرنا ہوتا ہے۔ وہ ایک پُر امن معاشرے کے قیام اور ہر طبقے کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں اور اخلاقی اقدار کا شعور دینے کے لیے مزاحمتی ادب تخلیق کرتے ہیں۔ اگر معاشرے کے لوگ با مقصد اور منطقی اصولوں کو اپناتے ہوئے مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والے چند گنہگار چنے مزاحمت کاروں کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں تو ایک آسودہ حال معاشرے کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ بعض اہل نظر مزاحمتی ادب جزوقتی ہونے کے قائل ہیں اور اس کے خاص مقاصد پر مشتمل ہونے اور فائدے کے بھی قائل نہیں۔ ظفر اقبال مزاحمتی ادب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ

"مزاحمتی ادب میں خرابی یہی ہے کہ اس کے مقاصد ادبی کم اور سیاسی زیادہ ہوتے ہیں۔ بے شک سیاست کو بھی ادب سے الگ نہیں کیا جاسکتا لیکن ایسے (سیاسی) ادب کو ادب کے دائرے میں رکھنے کے لیے جس توفیق اور بساط کی ضرورت ہوتی ہے اس

کے فقدان یا کمیابی ہی سے ساری گڑ بڑ پیدا ہوتی ہے۔۔۔ گویا سیاست اور مزاحمت حاوی ہے اور ادب اس کے بوجھ تلے دب گیا ہے" (۱۵)

بعض کا کہنا یہ ہے کہ مزاحمتی ادب، ادب سے عاری ہوتا ہے، اس میں صرف احتجاج و سیاست ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اعلیٰ ادب تخلیق کرنے کی صلاحیت اور مطالعہ و معلومات وغیرہ سے تہی دست افراد مزاحمت کے پرچم تلے سرگرم ہوتے ہوئے شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی اچھی رائے یہ ہے کہ یہ لوگ مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والے ہر شاعر و ادیب پر تنقید نہیں کرتے بلکہ یہ لوگ ادب میں مزاحمت کی وجود اور تحریروں میں ادب کے حاوی ہونے کے ساتھ مزاحمت کا رویہ اختیار کرنے کو اچھا عمل گردانتے ہیں جیسے فیض احمد فیض کی تحریروں میں احتجاج و مزاحمت ادب سے الگ اور حاوی نظر نہیں آتی۔ حقیقی مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والوں کی صف میں شہرت حاصل کرنے کے لیے بیٹھنے اور اپنے نقص و کمی پر پردہ ڈالنے کی خاطر مزاحمتی لباس میں ملبوس ادیبوں کے خلاف ظفر اقبال اس طرح لکھتے ہیں:

"مزاحمتی شاعری اپنی کوتاہی فن کو چھپانے ہی کا ایک حیلہ اور وسیلہ ہے اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔۔۔ فیض چونکہ شاعر تھے اسی لیے انھوں نے اپنی تمام تر مزاحمت پر حاوی ہو کر شاعری کی، چنانچہ ان کی زیادہ شاعری مزاحمتی ہونے کے باوجود شاعری کہلانے کی مستحق ہے کیونکہ وہ بھرپور شعری توفیق رکھتے تھے اور مزاحمت کے حوالے سے اس توفیق کو بروئے کار بھی لاتے تھے۔" (۱۶)

ان کی یہ رائے درست ہے۔ جب کبھی مشکل آجائے اور صعوبت و سخت آزمائش سے گزرنے کے بعد دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کس نے مزاحمتی ادب کو عمیق دل سے لکھا تھا اور کون سطحی بنیادوں پر لکھ رہا تھا۔ ہماری شاعری کی تاریخ گواہ ہے کہ ایسے مزاحمت کار ادیب و شاعر بھی تھے جن کو تنگ و تاریک کوٹھڑیوں، قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد جب باہر نکلتے تو نئے شعری اثاثے اور نئے عزم اور جذبے سے سرشار ہو کر نکلتے تھے لیکن بعض اپنے کردہ عمل پر نادم اور پریشان حالت میں نکلتے تھے۔ ان تمام حقائق کو شاعروں کے اشعار اور تاریخی حقیقت کے ضمن میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

د۔ مزاحمت کی جہات

مزاحمت مختلف نوعیت کی ہوتی ہے جیسے مسلح انداز میں مزاحمت کرنا، جمہوری طریقے سے مزاحمت کرنا، نظریاتی سطح پر مخالفت کرنا یا انفرادی یا گروہی اور اجتماعی طور پر بائیکاٹ اور اختلاف کرنا وغیرہ، اسی طرح مزاحمت کی بھی کئی جہات ہیں، عمومی طور پر مزاحمت تین جہات میں منقسم ہوتی ہے۔

i. مزاحمت کی سیاسی جہت:

اس جہت میں مزاحمت کار ملک کے آئین و قانون کی بالادستی کی حمایت و تسلسل کا خواہاں ہوتا ہے اور ملک کے قانون کو نظر انداز کرنے، قانون سے بالا قانون شکن سیاست دانوں کی منافقت اور غیر مخلص رویے کے خلاف کھل کر تنقید کرتا ہے۔ اس کی واضح مثال ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک کے سیاسی عدم استحکام کے خلاف لکھی جانے والی تحریریں ہیں۔ اسی جہت میں سیاسی عدم استحکام کی مخالفت کی طرح آمریت کے خلاف آواز اٹھانا بھی شامل ہے، جو غیر جمہوری راستوں سے ہوتے ہوئے مطلق العنان بن جاتی ہے۔ شعر اور ادیب اس کی مخالفت میں آواز بلند کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ شہناز اسی موضوع کے بارے میں لکھتی ہیں:

"--- جدید عہد میں ایسے ادب کو بھی مزاحمتی ادب سمجھا جاتا ہے جو ظالمانہ نظام یا آمر

حکمرانوں کے خلاف لکھا جاتا ہے۔ اس طرح وطن کی محبت، عوام دوستی اور فاتحین کے

خلاف جذبات کا اظہار مزاحمتی ادب کہلاتا ہے۔" (۱۷)

ii. مزاحمت کی سماجی جہت:

کسی بھی معاشرے اور زبان کے ادب کے مطالعے کے دوران یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر زبان و ادب کے شعرا و ادبا سماجی سطح پر ہونے والے ظلم اور عدالتی نا انصافی کے خلاف برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ مزاحمت کار ہمیشہ محکوم عوام کی حمایت اور عوام مخالف طاقتوں اور پالیسیوں کے خلاف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کار ہر وقت لوگوں کے منہ سے نوالہ چھیننے اور آزادی و حقوق سلب کرنے والے سرمایہ دار طبقے کی مخالفت کرنے کے ساتھ ساتھ غریب لوگوں کو غلام اور زیرِ غتاب رکھ کر خدمت لینے والے جاگیر دار طبقوں کے خلاف تلخ لہجے میں لکھتے آ رہے ہیں۔ سرمایہ دار مزدوروں کا استحصال کرتا ہے جبکہ جاگیر دار ہاریوں کا جینا حرام

کر دیتا ہے۔ جاگیرداروں کی طرف سے ہونے والے اذیت ناک اور سفاکانہ رویے کے خلاف آواز اٹھانا اسی جہت کا ایک حصہ ہے۔

iii. مزاحمت کی مذہبی جہت:

کلی طور پر شعر اور تخلیق کار آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی مذہب کے خلاف نہیں لکھتے بلکہ ان مذہبی لوگوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر اسلام اور اسلامی شعائر کو نقصان پہنچاتے ہیں نیز مذہب کے نام پر لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ تخلیق کار مذہب کے ٹھیکے داروں کے قول و فعل میں تضاد پاتے ہیں تو ان کے خلاف قلم سے جہاد کا اعلان کرتے ہیں۔ ان تینوں جہات کے خلاف مزاحمت کاروں کی مزاحمت و مخالفت کے بارے میں ابرار احمد لکھتے ہیں:

"ہر سماج میں بالادست طبقے عوام کا استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ریاست کے نام پر مذہب کے نام پر، سیاست کے نام پر، معیشت کے نام پر اور ان استحصالی قوتوں کے ہاتھ جھٹک دینے کے لیے مزاحمتی عمل بھی جاری و ساری ہے۔" (۱۸)

ہ۔ عالمی ادب میں مزاحمت کی روایت

۱. انگریزی ادب میں مزاحمتی پہلو

اگر انگریزی زبان و ادب کی طرف دیکھا جائے تو مختلف مزاحمت کار اپنی تخلیقات میں مزاحمتی رنگ اپناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بہت سے شاعروں، ناول نگاروں اور لکھاریوں نے سیاسی، سماجی اور اقتصادی نا انصافیوں کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ مزاحمت کار شعر اور ادب اپنی سوسائٹی میں موجود نا انصافی اور عدم مساوات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں مزاحمت کی آوازیں ہر جگہ سنائی دی جاتی ہیں۔ انگریزی ادب میں شعر اور ناول نگاروں نے نسلی امتیازات کے خلاف کھل کر تنقید کی ہے۔ انہوں نے نسلی امتیازات کی مخالفت کرنے کے ساتھ ساتھ گوروں کی بالادستی اور ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ بہت سے مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والوں نے ویتنام اور عراق پر مسلط کی جانے والی جنگوں کی مذمت کی ہے۔

انگریزی میں مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والوں میں سے ایک شاعر لنگسٹن ہیو جز ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں گوروں کے رویوں اور حکمرانوں کی پالیسیوں پر کڑی تنقید کی ہے اور اپنی تخلیقات کی وساطت سے ملک میں امن و امان اور پرسکون فضا قائم کرنے کی سعی کی ہے۔ لنگسٹن ہیو جز نے مساویانہ نظام اور پالیسی بنانے اور مختلف قوموں کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کی بات کی ہے۔ انگریزی مزاحمتی ادب لکھنے والوں میں ایکس ڈائمنڈ بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مشہور ناول نگار البرٹ کامیونے بھی تقسیم بندی کی مخالفت کی ہے۔ نوم چومسکی نے بھی حکمرانوں کی انا اور غلط پالیسیوں کی شدید مخالفت کرتے ہوئے دوسرے ملکوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک اور غیر قانونی اقدام کرنے کی مذمت کی ہے۔ مزاحمت کی اصطلاح سب سے پہلے فلسطینی مزاحمت کار غسان کنفانی نے ادبی دنیا میں متعارف کرائی۔ انہوں نے اسرائیل کے فلسطین پر قابض ہونے کے خلاف احتجاج کیا۔ ان کے ساتھ محمود درویش نے بھی سامراجیت کی بھرپور مخالفت کی ہے۔

ii. عربی ادب میں مزاحمتی پہلو:

عربی ادب کی طرف اگر نگاہ کی جائے تو زمانہ قدیم سے ہی اس میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ قبائلی اور قومی رسومات اور فخر و مباہات کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن جب سامراجی قوتوں نے قبلہ اول کی مقدس سرزمین پر ناپاک قدم جمانے کے بعد وہاں کے مسلمان باشندوں پر عرصہ حیات تنگ کرتے ہوئے ان کو دوسری جگہوں اور ملکوں میں پناہ گزین بننے پر مجبور کر دیا اور ظلم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آج بھی اپنی ہی سرزمین پر فلسطینی سخت حالات اور موت و حیات کی کشمکش میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی مزاحمتی ادب کی تخلیق کا آغاز بھی وہاں سے ہوا اور عربی شاعری نے رخ بدلتے ہوئے مزاحمتی رویے کی صورت اختیار کر لی۔ وہاں پر ایسے شعر اپید ہوئے جو اپنی تحریر و تقریر سے سامراج کو لاکارتے ہوئے مظلوم و مقہور اور بے بس عوام کو عزم و ہمت دینے لگے۔ ان شعرا میں سے ایک محمود درویش ہیں۔ جنہوں نے سکول کے ایام سے ہی فلسطین کی پاک سرزمین پر اسرائیلی ناجائز قبضے کے خلاف آواز بلند کی اور فلسطین کو اپنی شاعری کا موضوع بنا لیا۔ وہ ہر وقت فلسطینیوں کو سامراج کا مقابلہ کرنے اور خون کا آخری قطرہ بھی اس سرزمین کی آزادی کے لیے قربان کرنے کا درس دیتے رہے۔ ان کو اپنی مزاحمتی شاعری اور باطل کے خلاف آواز حق بلند کرنے کی وجہ سے قید

میں رکھا گیا لیکن انہوں نے اس گلستان اور سرزمین انبیاء کی آزادی و حفاظت کی خاطر جان تک قربان کرنے کا عہد کرتے ہوئے اپنے قلم کو اس موضوع کے لیے وقف کیا۔ ان کی بامقصد شاعری کے حوالے سے احسن قتیچی لکھتے ہیں:

"محمود درویش کو عصر حاضر کا عربی ادب کا نمائندہ شاعر تصور کیا جاتا ہے، ان کی عظمت کا گواہ تو آنے والا زمانہ ہو گا کہ ان کے لکھے اشعار کتنا عرصہ زندہ رہتے ہیں لیکن ناقدین ان کو بیسویں صدی کا انتہائی معتبر نام قرار دیتے ہیں، ان کی شاعری میں جنت گمشدہ یعنی سن انیس سو اڑتالیس اور پھر سن انیس سو سڑسٹھ میں مقبوضہ ہو جانے والے ارضِ فلسطین کا دکھ اور صدمہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے" (۱۹)

وہ جیل میں رہتے ہوئے بھی اپنی مظلوم قوم کو آزاد کرانے کا خواب دیکھتے ہوئے اپنی قوم کو غاصبوں سے ہر آن نبرد آزما ہونے، استقامت دکھانے اور غیرت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقابلہ کرنے کی ہمت اور حوصلہ دیتے رہے۔

iii. فارسی ادب میں مزاحمتی پہلو:

فارسی ادب میں مزاحمت کی جہت نمایاں ہے۔ خصوصاً شعرا کے ہاں یہ پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ایران کی شہنشاہیت کے خلاف شعرا نے بہت کچھ لکھا۔ خاص کر شاہ پہلوی کے دورِ حکومت میں جب عوام پر ظلم و بربریت کی خطرناک صورت حال کا آغاز ہوا۔ حکومت کے خلاف بولنے والوں کی زبان اور آواز کو خاموش کرانے کا شاہی فرمان بھی جاری کر دیا گیا۔ بہت سے شعرا کو شاہ پہلوی کے دورِ آمریت میں مار دیا گیا۔ اس خطرناک صورت حال کے باوجود وطن سے محبت کرنے والے شعرا نے شاہ کے سامراج کی غلامی قبول کرتے ہوئے عوام دشمنی پر مبنی پالیسی کے نفاذ کے خلاف بغاوت کی۔ یہ شعرا امر کی ملک دشمنی اور سازش کے خلاف ہر جگہ علم بغاوت بلند کرتے رہے۔

فارسی ادب میں مزاحمت کے حوالے احمد شاملو اور فرخی یزدی کے نام نمایاں ہیں۔ احمد شاملو ایران کی غیر مہذب رسومات سے اختلاف کرتے ہوئے اخبارات اور مختلف مجلوں کی نگرانی کرتے رہے۔ انہوں نے نو عمری میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کی حکومت مخالف تحریروں کی وجہ سے ان کو ۱۹۴۹ء میں گرفتار کر لیا گیا اور

۱۹۵۳ء میں ان کو دوبارہ قید کی سزا سنائی گئی۔ اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور انقلاب سے پہلے شاہ کی حکومت کی مخالفت میں مسلسل لکھتے رہے۔

فارسی مزاحمتی شاعری کے حوالے سے ایک اہم نام فرخی یزدی کا ہے۔ وہ ایک حقیقی باغی شاعر تھے۔ شہنشاہ کے حکم پر ان پر بہت ظلم روا رکھا گیا۔ ان کے ہونٹ سی دیے گئے پھر بھی وہ خاموش نہیں ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد فرخی تھا اور وہ یزد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی مزاحمت کا آغاز اس وقت ہوا جب تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک انگریزی مشنری مدرسہ جانے کے بعد انہوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ کے خلاف نظم لکھی اور مدرسہ والوں نے ان کو یہ نظم لکھنے کے جرم میں وہاں سے نکال دیا۔ ان کی شاعری وطن سے محبت اور وطن دشمن شہنشاہیت کی مخالفت پر ہی مشتمل ہے۔ ان کی شاعری سیاسی، سماجی مسائل پر مشتمل ہے اور رومانویت کا پہلو بہت کم ہے۔ انہوں نے نوروز جیسی رسومات کے مواقع پر بھی وطن سے غداری کرنے والوں کی مذمت کی جبکہ اس وقت اکثر شعر شہنشاہ کے قصیدے کہہ رہے تھے۔ انہوں نے حکمرانوں کو قانونی حکومت قائم کرنے کی دعوت دی۔ ان کی مزاحمتی شاعری اور رویے میں اتنی شدت تھی کہ حکمران خائف ہو کر ان کو کئی بار گرفتار کر کے قید میں رکھا۔ ۱۹۱۹ء میں ان کو گرفتار کرنے کے بعد میں وطن بدر کر دیا گیا۔ وہ اپنی سرزمین کے لیے ہر چیز قربان کے لیے تیار رہتے تھے۔ وہ اپنے اس موقف سے پیچھے نہیں ہٹے۔ ان کے اشعار میں مزاحمت و بغاوت کی جہت بہت نمایاں ہے۔ ان کے اشعار کو ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے نقل کیا ہے کہ

ایں ملک یک انقلاب می خواہی و بس

خونریزی بے حساب می خواہد و بس

امروز و گر درخت آزادی

از خون من و تو آب می خواہد و بس^(۲۰)

وہ ہر وقت انقلاب کی بات کرتے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ قید خانوں میں مامور حکومتی افراد نے اپنے آقاؤں سے یہ شکایت کی کہ فرخی یزدی باغیانہ اشعار کہتے ہوئے قیدیوں کو جذبات میں لا کر ان کا ذہن تبدیل کر رہے ہیں۔ وہ دوران قید دیواروں پر بھی باغیانہ اشعار لکھتے تھے۔

iv. اُردو ادب میں مزاحمت کی روایت:

اُردو زبان میں ابتدا ہی سے مزاحمت کے آثار موجود ہیں۔ قدیم شعرا بھی اپنی تحریروں میں اپنے دور کی بادشاہت و حکومت کی نااہلی اور رعایا کی حالت زار پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ اُردو زبان میں جعفر زٹلی کو پہلا مزاحمتی شاعر گردانا جاتا ہے اگرچہ بعض محققین اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں۔ جعفر زٹلی کے پہلا مزاحمتی شاعر ہونے کے بارے میں رشید امجد لکھتے ہیں:

"۔۔۔ اُردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو شمالی ہند میں شاعری کا آغاز ہی مزاحمتی رویے سے ہوا۔ جعفر زٹلی پہلا مزاحمتی شاعر ہے جس نے اورنگزیب کے نالائق بیٹوں کے خلاف نظمیں لکھیں۔ جعفر زٹلی، فرخ سیر تک تمام نالائق اور نااہل حکمرانوں کے خلاف کھل کر لکھتا رہا اور اپنے اس شعر پر

سکہ زد برگندم و موٹھ و مٹر
پادشاہ کش فرخ سیر

فرخ سیر کے حکم پر پھانسی لگا" (۲۱)

جعفر زٹلی نے صرف حکمرانوں کی مخالفت نہیں کی بلکہ معاشرے کے لوگوں کے مراسم میں لا تعلقی اور کج فکری، عزیز واقارب کے مابین ربط و تعلق کا فقدان نظر آنے کے خلاف بھی اپنے احساسات کا برملا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے ظالموں اور طاقتوروں کے زبان و بیان اور اہل حرفت کی ناقدری وغیرہ کے خلاف بھی لکھا ہے۔ جعفر زٹلی کے معاشرتی مسائل کو اجاگر کرنے کے حوالے سے سید محمد ابوالخیر کشتی لکھتے ہیں:

"۔۔۔ ایک طرف لوگ باہمی تعلقات اور رشتوں کے آداب بھولنے لگے تھے تو دوسری طرف حاکموں کے ذہن میں عدل و انصاف کا کوئی تصور نہ رہا تھا۔ ظلم قانون بن گیا تھا اور ہنرمندوں کے در بدر رسوائی کے ساتھ پھرنے کا دور شروع ہو گیا تھا۔ جعفر زٹلی نے "در احوال دنیا و اہل" کے عنوان سے انہیں مسائل کو پیش کیا ہے۔

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائی میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور ہے" (۲۲)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بھی مزاحمت تسلسل کے ساتھ جاری رہی اور اس صدی کے نصف آخر میں نثر نگار اور شاعر بھی مزاحمتی پہلو اپناتے ہوئے معاشرے کی غیر یقینی صورت حال اور انگریزوں اور ہندوؤں کی سازشوں کے خلاف لکھتے رہے۔ رشید امجد کا کہنا ہے کہ ”یہ سلسلہ انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہا لیکن بیسویں صدی کا آغاز بھر پور مزاحمت سے ہوا۔ شاعری میں اقبال اور افسانے میں پریم چند نے موجودہ صورت حال کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔“ (۲۳)

قیام پاکستان کے بعد اور قائد اعظم محمد علی جناح کی رحلت کے بعد ملک میں عجیب صورت حال پیدا ہو گئی ان کے بعد کوئی مخلص رہنما نہیں آیا اور مسلم لیگ کی بنیاد متزلزل ہو گئی اور آخر کار ۱۹۵۸ء میں مارشل لانا نافذ کر دیا گیا۔ تخلیق کاروں نے اس مارشل لا کے خلاف لکھا۔ ان تخلیق کاروں میں حبیب جالب کھل کر مزاحمت کرتے ہوئے بغاوت کی منزل تک چلے گئے۔ رشید امجد، حبیب جالب کی مزاحمت و بغاوت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ادیبوں پر طنز کرنے کے ساتھ ساتھ جالب نے نئے نظام حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان بھی کر دیا۔

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں جانتا، میں نہیں مانتا" (۲۴)

افتخار عارف بھی حبیب جالب کے بارے میں کہتے ہیں کہ ”پاکستان میں شعر کا وقار اور عزت و آبرو اگر بچائی ہے تو وہ حبیب جالب ہیں“ (۲۵) سبط حسن نے حبیب جالب اور جسٹس کیانی کی جرأت و پامردی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے لکھا ہے کہ ”ایوب خان کے عہد آمریت میں دو شخصیتوں نے قوم کی عصمت و آبرو بچائی تھی، ایک جسٹس کیانی مرحوم دوسرے حبیب جالب۔“ (۲۶) لوگ فیض احمد فیض کے نہ صرف نام سے آشنا ہیں بلکہ ان کی مزاحمت و بغاوت کے بارے میں بھی آگہی رکھتے ہیں۔ راولپنڈی سازش کیس میں ایک بڑا کردار فیض کا بھی رہا ہے۔

فیض کی مزاحمتی پہلو کے بارے میں ابرار احمد لکھتے ہیں:

"فیض احمد فیض اپنے مخصوص کلاسیکی اور دھیمے لہجے میں جبر و استبداد کے خلاف جہاد میں مصروف تھے۔ وہ خاموش رہنے والوں کو بول اٹھنے کا درس دیتے رہے۔

بول یہ تو تھوڑا وقت بہت ہے
 جسم و زبان کی موت سے پہلے
 بول کر سچ زندہ اب تک
 چشمِ نم، جان شورید کافی نہیں
 تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
 آج بازار میں پا بجولاں چلو" (۲۷)

احمد فراز بھی فیض احمد فیض اور جالب کے بعد توانا آواز بن کر آمریت کو لٹکارتے رہے۔ وہ معاشرے
 میں موجود اہلِ بنیشت کو سزا اور ظلمت پرستوں کو انعام و اکرام سے نوازنے کے خلاف بولتے رہے۔

قیمت بے ہنراں نیلیم و مرجان ٹھہری
 قسمت دیدہ وراں سنگ ملامت دیکھوں
 (نابینا شہر میں آئینہ، ص ۳۵)

احمد فراز کو یقین تھا کہ قاتل کی جاہ و حشم دائمی نہیں ہوتی اور ظلم کا بادل کسی نہ کسی دن چھٹ جائے گا۔ بقول ان
 کے

بزمِ مقتل جو سچے کل تو یہ امکان بھی ہے
 ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے
 (نایافت، ص ۵۴)

احمد فراز کی شاعری میں بے شمار اشعار اور نظمیں ایسی مل جاتی ہیں جن میں وہ آمر و جابر کے خلاف محاذ
 آرائی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

حوالہ جات

- ۱۔ عابد حسین سیال، ڈاکٹر، احمد فراز کے بعد، مشمولہ، ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، شمارہ ۸۱، جلد ۱۸، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۳
- ۲۔ افتخار عارف، (انٹرویو) از محمد رضا، اسلام آباد، ۲۶ اپریل ۲۰۱۹ء بہ مقام ادارہ فروغ اردو اسلام آباد، بوقت ۲ بجے، بروز جمعہ
- ۳۔ کشور ناہید، پھول کھلنے کے زمانے آئے، مشمولہ ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، شمارہ ۸۱، جلد ۱۸، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۸
- ۴۔ صائمہ نورین بخاری، احمد فراز، روشن ستارہ، انمول خیال، مشمولہ ماہِ نوا احمد فراز نمبر، ادارہ مطبوعات پاکستان لاہور، شمارہ ۸: جلد ۲۱، جنوری ۲۰۰۹ء ص ۱۲۶
- ۵۔ معصوم شرقي، ڈاکٹر، احمد فراز نئے شعرہ آفاق کا مسافر، مشمولہ نہال شاخِ غم (احمد فراز فن و شخصیت)، جگر اکیڈمی کانپور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۸
- ۶۔ نزہت عباس، احمد فراز اور درد آشوب، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان کراچی، جلد ۸۱: شمارہ ۳ مارچ ۲۰۰۹ء، ص ۵۴
- ۷۔ سید ضمیر جعفری، اردو شاعری کا سکندر اعظم، مشمولہ ماہنامہ چہار سو، راولپنڈی، جلد ۳، شمارہ ۳۰-۳۱ جنوری-فروری ۱۹۹۵ء، ص ۲۲
- ۸۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ جدید اردو غزل، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۸۸ء طبع اول، ص ۸۹۲
- ۹۔ مہذب لکھنوی، مہذب اللغات، نامی پریس لکھنؤ، ص ۱۴۳
- ۱۰۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ جلد سوم و چہارم، اردو سائنس بورڈ، لاہور، طبع پنجم، ۲۰۰۶ء ص ۳۳۹
- ۱۱۔ عبدالحفیظ، ابوالفضل مولانا، مصباح اللغات، مکتبہ برہان نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۷۱۴
- ۱۲۔ نعیم بیگ، مزاحمتی ادب اور اس کی تشریحات، www.deedbanmagazine.net، ۵ نومبر ۲۰۱۸ء، ۳:۰۰pm

۱۳۔ ابرار احمد، مزاحمتی ادب، مشمولہ مزاحمتی ادب اردو، مرتبہ رشید امجد، ڈاکٹر، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۲۸

۱۴۔ مبارک علی، ڈاکٹر، مزاحمتی تحریکیں اور ان کے سماج پر اثرات، www.urduweb.org، ۱۰ ستمبر ۲۰۱۸ء، ۸pm:۰۰

۱۵۔ ظفر اقبال، مزاحمتی ادب کے بارے میں چند پھوٹے خیالات، مشمولہ سہ ماہی رجحانات، جولائی، دسمبر ۱۹۹۴ء، گورا پبلشرز، لاہور، ص ۶، ۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۲

۱۷۔ روبینہ شہناز، ڈاکٹر، اردو تنقید میں پاکستانی تصور قومیت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۷

۱۸۔ ابرار احمد، مزاحمتی ادب، مشمولہ مزاحمتی ادب اردو، مرتبہ: رشید امجد، ص ۲۸

۱۹۔ احسن قتیسی، عربی مزاحمتی ادب، www.deedbanmagazine.net، ۱۰ ستمبر ۲۰۱۸ء، ۱۰:۰۰am

۲۰۔ ظہور الدین احمد، ڈاکٹر، نیا ایرانی ادب، یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور، ص ۸۰

۲۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویہ اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ص ۷۳

۲۲۔ سید محمد ابوالخیر کشفی، اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۱۰۸

۲۳۔ رشید امجد، مزاحمتی ادب، مشمولہ مزاحمتی ادب اردو، مرتبہ رشید امجد، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۲۶

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۷

۲۵۔ افتخار عارف سے راقم کا انٹرویو، ۲۶ اپریل ۲۰۱۹ء، بمقام ادارہ فروغ اردو اسلام آباد، بوقت ۲ بجے، بروز جمعہ

۲۶۔ سبط حسن، بحوالہ ابرار احمد، مزاحمتی ادب مشمولہ مزاحمتی ادب اردو، مرتبہ رشید امجد، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۵۴

۲۷۔ ابرار احمد مزاحمتی ادب، مشمولہ مزاحمتی ادب اردو، مرتبہ رشید امجد، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء،

ص ۵۹

باب دوم:

احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی سیاسی جہت

الف۔ سیاست کے مفہوم و معانی

لفظ سیاست کے مفہوم، معانی اور تعریف کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ عربی زبان کا لفظ 'سیاست' انگریزی زبان میں استعمال ہونے والے لفظ Politics کا ہم معنی نہیں ہے کیونکہ عربی زبان کے لفظ سیاست کا مفہوم انگریزی زبان کے لفظ Politics کی نسبت عام اور وسیع ہے۔ عربی زبان میں استعمال ہونے والے لفظ سیاست کے مفہوم و معانی میں اصلاح نفس، خاندانی سیاست، تعزیری سیاست اور مطلق اصلاحی کام سب شامل ہیں لیکن انگریزی زبان میں استعمال ہونے والا لفظ Politics صرف اور صرف ملکی، قومی اور حکومتی سیاست کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان کے لفظ سیاست میں وسعت مفہوم کے دعویٰ کرنے والے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے انگریزی زبان کے لفظ Politics کا مترادف "السیاسة المدینة" پیش کرتے ہیں جو کہ محدود معنی رکھتا ہے۔

سیاست کسی بھی ملک کا لازمی امر ہے کوئی بھی ملک سیاست سے خالی ہو یہ ناممکنات میں سے ہے لیکن سیاست کی ابتدا و آغاز کے بارے میں دیکھا جائے تو دیگر علوم و فنون کی طرح سیاست کی ابتدا بھی یونان سے ہوئی ہے۔ سیاست کا محور و مرکز اجتماعیت ہے۔ سیاست کی ابتدا یونان سے ہوئی ہے اس کے بہت سے شواہد ملتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یونان کا نظام انفرادی نہیں تھا بلکہ اجتماعی نظام تھا۔

سیاست اور اجتماعیت کے حوالے سے اگر تاریخ انسانی کا مطالعہ کیا جائے تو اوائل انسان کی تاریخ نہایت اہم ہے۔ اُس دور کے انسان کی فکر و سوچ اور علم کی کمی کی وجہ سے فرد کی انفرادی زندگی نہایت مشکل سے گزر رہی تھی۔ اُس وقت کا انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ عدم ربط و تعلق اور اجتماعی سسٹم نہ ہونے کی وجہ سے مختلف غاروں اور جنگلوں کو اپنا مسکن بنا کر مشکل ترین دور سے گزر رہا تھا۔ نشیبی علاقوں، جگہوں میں جمع شدہ پانی سے حیوانات اور انسان دونوں سیراب ہوتے تھے لیکن جب فطری تقاضوں کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہادی و رہنما آئے۔ فکر و شعور اور علم کی شمع کو فروزاں کرنے کے بعد انسان انفرادی دلدل سے نکل کر اجتماعیت کی طرف رواں دواں ہوا اور ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دیں۔

سیاست کے ارتقا و تسلسل کی بات کی جائے تو اخلاقیات سے اس کا مضبوط رشتہ ہے۔ سیاست صبر و تحمل کے بغیر ثمر آور درخت ثابت نہیں ہو سکتی۔ سیاست کی روح در حقیقت انسان کے حقوق کی پاسداری ہے۔ اس نظام میں نظریاتی اور زمینی سرحدوں کا تحفظ شامل ہے۔ صاحبِ فرہنگ آصفیہ سیاست کے معانی اس طرح لکھتے ہیں:

"سیاست (ع) اسم مونث۔ (۱) ملک کی حفاظت و نگرانی، حکومت و سلطنت (۲) انتظام ملک، بندوبست، دار و گیر، نظم و نسق (۳) تنبیہ، چشم نمائی، دھمکی مار پیٹ گوشالی (۴) رعب داب قہر و غضب، خوف و دہشت، سخت گیری۔" (۱)

سیاست کے معانی و مفہوم کے بارے میں مولانا گوہر رحمانی لکھتے ہیں:

"سیاست اور سوس کے اساسی معنی ہیں 'اصلاح کرنا اور سنوارنا' اس لغوی مفہوم کی مناسبت سے یہ دونوں ریاست و حکومت اور تدبیر مملکت کے معنوں میں بھی بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے حکومت اور ریاست کا مقصد بھی عوام کی حالت سنوارنا اور اصلاح کرنا ہوتا ہے۔" (۲)

ب۔ تیسری دنیا کے بارے میں ترقی یافتہ ممالک کے رویے

تھرڈ ورلڈ یعنی "تیسری دنیا" کی اصطلاح ایک نئی اصطلاح ہے۔ نئی اصطلاح ہونے کے ساتھ اس کے معانی و مفہوم کے بارے میں کافی اختلافات نظر آتے ہیں۔ بعض اہل نظر "تیسری دنیا" غریب اور پسماندہ ممالک کو قرار دیتے ہیں۔ جبکہ بعض اپنے نظریے کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام اور روس کی اشتراکیت اور ان دونوں ملکوں کے حامی ممالک سے ہٹ کر باقی ممالک "تیسری دنیا" کہلاتے ہیں۔ کوثر نیازی تیسری دنیا کی اصطلاح کے جدید ہونے کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خود تیسری دنیا، کی اصطلاح ایک بالکل نئی اصطلاح ہے اور اس کے عوامل اور مضمرات بھی کلیتاً نئے ہیں آج کل اس موضوع پر بہت بحث و تمحیص ہو رہی ہے۔" (۳)

تیسری دنیا کی اصطلاح کا آغاز کب اور کیسے ہوا اس کے بارے میں ڈاکٹر نیر عباس لکھتے ہیں:

"یہ اصطلاح ۱۰۵۲ء کے بعد سرد جنگ کے زمانے میں فرانسیسی الفریڈ ساؤں نے وضع کی اور اس سے مراد وہ ممالک تھے جو پہلی دنیا یعنی سرمایہ دار ملکوں اور دوسری دنیا یعنی اشتراکی ملکوں کے علاوہ تھے۔" (۴)

تیسری دنیا کے بارے میں ڈاکٹر آغا سہیل کی رائے یہ ہے کہ پسماندہ، غربت اور استحصال شدہ ممالک تیسری دنیا میں شامل ہیں وہ اپنی رائے یوں بیان کرتے ہیں:

"تیسری دنیا کا مفہوم دوسری جنگ عظیم کے بعد بڑی تیزی سے واضح ہونا شروع ہوا، بالخصوص وہ خطے اور علاقے جن کا کسی نہ کسی طریق پر استحصال ہوا تھا یہ استحصال اقتصادی بھی (بلکہ اقتصادی ہی زیادہ تھا) معاشرتی بھی، تہذیبی اور ثقافتی بھی۔۔۔ اور وہ استعماری نظام کے جبر و تعدی کا شکار بنے وہاں کے مسائل انتہائی جاں گسل تھے" (۵)

تیسری دنیا کے بارے میں مغربی ممالک کا رویہ انتہائی منفی اور نامناسب ہے۔ مغربی ممالک غریب ممالک یا ترقی پذیر ممالک کے ذخائر پر قبضہ کر کے صرف اور صرف اپنی دولت، قوت، طاقت اور اقتدار کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے درپے ہیں اور تیسری دنیا کے ذخائر اور معدنیات پر قبضہ کرنے اور انہیں حاصل کرنے کے لیے سیاست کرتے ہوئے پالیسیاں مرتب کرتے رہتے ہیں اسی نکتے کی طرف محمد یحییٰ نے اس طرح اشارہ کیا ہے:

"یہ کارپوریشنیں اور ملٹی نیشنل کمپنیاں، جن کے ہیڈ کوارٹر امریکہ میں اور شاخیں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں، اپنی معدنی وسائل کی بھوک اور تیل کی پیاس مٹانے کے لیے "ترقی" کے نام پر کمزور قوموں کا استحصال کر رہی ہیں۔" (۶)

رضی عابدی نے تیسری دنیا کی پہچان کے لیے مختصر اور جامع خیال پیش کیا ہے جس کی روشنی میں ہم تیسری دنیا کے ممالک کی پہچان بہت جلد اور آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ اس موضوع کی بحث کرتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں:

"تیسری دنیا ایک وسیع اور متنوع دنیا ہے اور اس کی سب سے بڑی پہچان وہ جدوجہد ہے جو یہ دنیا خود کو نوآبادیاتی شکنجوں سے آزاد کرنے کے لیے کر رہی ہے۔" (۷)

مغربی ممالک کے رویے اور پالیسیاں تیسری دنیا کے ممالک کے خلاف زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ طاقتور ممالک اپنی دولت و طاقت میں اضافہ کرنے کے لیے ان ممالک کے مکینوں کو اپنا غلام بنا کر ان کی

دولت پر ڈاکہ ڈال کر کئی نسلوں کے لیے سرمایہ اکٹھا کر رہے ہوتے ہیں۔ مغربی ممالک تیسری دنیا کے ممالک کو ہتھیار سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں بعض ممالک کی مثال دی جاسکتی ہے جیسے کانگو، عراق، افریقہ، بحرین، کویت وغیرہ

ج۔ مقامی سیاست پر عالمی سیاست کے اثرات

ادھر کی آگ ادھر بھی پہنچ نہ جائے کہیں

ہوا بھی تیز ہے جنگل قریب شہر بھی ہے

(بے آواز گلی کوچوں میں، ص ۹۸)

اگر ہم بیسویں صدی کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ایسی صدی ہے جس کو انقلابات و تغیرات کی صدی کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ بیسویں صدی میں دنیا کے بہت سے ملکوں میں تحریکیں چلیں اور انہی تحریکوں کے سبب بعض ممالک تقسیم ہوئے، بعض ممالک میں حکومتیں گریں تو بعض ممالک میں نئی حکومتیں اور سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ طاقتور ممالک اپنی ریاست کو وسعت دینے کے لیے دوسرے ملکوں پر حملہ آور ہوتے ہوئے پوری دنیا پر اپنی طاقت اور اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ایشیائی ممالک خاص کر اسلامی ممالک مغربی سیاست کے زیر اثر چلے آ رہے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری و ساری ہے۔ برصغیر کی تاریخ بھی الگ نوعیت کی تاریخ ہے اس خطے کی تاریخ میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے بعد برصغیر مغربی سیاست کے زیر تسلط آ گیا۔

برصغیر کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ برطانوی حکومت کے لوگ تجارت پیشہ افراد کے بھیس میں نہ صرف برصغیر میں آباد ہوئے بلکہ مسلم حکمرانوں کو مسند حکمرانی سے گرا کر خود صاحب اقتدار بن کر رہنے لگے۔ نیز اہل ہند کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کے لیے حالات سازگار بنانے لگے۔ یہ کام انہوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ کیا اور زمینوں پر بھی قبضہ کر کے مالک بن گئے۔ انہوں نے پہلے اپنی سیاسی بنیاد کو مضبوط اور مستحکم کیا پھر اپنی پالیسی کے مطابق حکمرانی کرنے لگے۔ برصغیر کی اسی تاریخ اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قاسم یعقوبی لکھتے ہیں:

"پورے برصغیر میں مرکزی حکومت کے بے اثر ہو جانے کی وجہ سے ریاستوں میں خانہ

جنگی کا سماں ہے۔۔۔ زمینوں کے معاملے میں نیلامی کا طریقہ کار رائج کر دیا گیا جو بھی

بڑھ کر بولی دیتا زمین اس کے حوالے کر دی جاتی۔۔۔ انگریزوں نے مقامی لوگوں کو

ساتھ ملانے کی خاطر ریاستوں کو مقامی جاگیرداروں میں تقسیم کر دیا جس کی وجہ سے ان کا اثر و رسوخ ان علاقوں میں بھی ہو گیا جہاں ان کی افواج نہ ہونے کی برابر تھیں ان تمام حالات نے ۱۸۵۷ء کے انگریز راج کو تحریک دی۔" (۸)

برطانوی سامراج نے ہندوستان کے رہنماؤں اور لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر جنگ عظیم اول میں یہ لوگ ان کی مدد و حمایت کریں تو اہل ہندوستان کو مراعات اور اختیارات دیں گے لیکن بعد میں نہ صرف اس وعدے سے مکر گئے بلکہ انہوں نے رول ایکٹ کے ذریعے مسلمانوں کو غلامی کی خبر سنا دی۔ انہوں نے ایسے قوانین وضع کیے جن کے ذریعے بلا جواز گرفتاریاں کی گئیں اور مقدمات چلائے بغیر سزا دلانے کا کام اپنے کارندوں کو تھما دیا۔ جب انہوں نے یہ فتیج کام کیا تو صورت حال کشیدہ ہو گئی۔ انگریزوں کے ظلم و ستم اور غلط قوانین کے خلاف احتجاج اور ہڑتال کرنے کا فیصلہ ہوا، اس احتجاج اور ہڑتال کے فیصلے میں ہندوستان کے ہندو اور مسلمان متحد تھے اسی موضوع پر اے حمید لکھتے ہیں:

"۲۶ اپریل کو کانگریسی اور مسلمان ہندوؤں کی ایما پر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں کامیاب ہڑتال کی گئی۔ پولیس نے گولی چلا دی دو ہڑتالی مارے گئے، لاہور، امرتسر، بمبئی اور دہلی میں احتجاجی جلوس نکالے گئے لوگوں نے اکاؤکا انگریز شہریوں کو زد کوب کرنا شروع کر دیا۔" (۹)

افغانستان نے ابتدا میں قیام پاکستان کو قبول نہیں کیا بلکہ مخالفت کی۔ یہ بات ناقابل تردید ہے کہ افغانستان پاکستان کا ہمسایہ ملک ہے۔ پاکستان کی بڑی سرحدیں افغانستان کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ افغانستان بھی عالمی طاقتوں کی تجربہ گاہ بنتا چلا آ رہا ہے۔ عالمی سازش کے تحت وہاں کے حالات اتار چڑھاؤ کا شکار رہتے ہیں اور اس کا اثر پاکستان پر بھی پڑ جاتا ہے۔ جب افغانستان پر جنگ مسلط کر دی گئی تو پاکستان کو اس جنگ میں دھکیل کر اس کا نام افغان جہاد رکھا گیا۔ اس جنگ میں پاکستان کو شامل کرنا ایک عالمی سیاست و سازش تھی۔ اس جنگ کو نہ صرف اسلامی رنگ اور نام دیا بلکہ خلافت کی بحالی اور اسلامی ریاست کی وسعت کا نقشہ بھی دکھایا گیا۔ امریکہ نے پاکستان کو اس جنگ میں شامل کرنے کے لیے کیا حربہ استعمال کیا اس حوالے سے محمد عباس شاہ لکھتے ہیں:

"اس جنگ میں وسیع پیمانے پر ڈالر، ریال اور پونڈ کے ساتھ ساتھ سعودی عرب جیسے اسلامی تشخص کے حامل ممالک کا گہرا اثر و رسوخ بھی استعمال ہوا۔ امریکہ پاکستان میں

مذہبی قوتوں کو ایک بیج پر لانے میں اپنے اتحادی اسلامی ممالک کے پاکستان پر اثرات کو خوب استعمال کیا۔" (۱۰)

ہندوستان کی پوری کوشش رہی ہے کہ پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دے کر کمزور کیا جائے اور سفارتی سطح پر پاکستان کو تنہا کرنے کے لیے بھارت سر توڑ کوشش کرتا چلا آ رہا ہے۔ اب انڈیا، امریکہ اور دیگر ممالک مل کر افغانستان کی سر زمین کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان کی جوہری طاقت ختم کرنے کے درپے ہیں۔ امریکہ کو بھی یہ جوہری طاقت رکھنے والی ریاست اور مسلمانوں کی ترقی ہضم نہیں ہو رہی۔ امریکہ کی منافقانہ پالیسی کے بارے میں ماہنامہ اقدار کے ادارے میں اس طرح کی تحریر موجود ہے۔

"ہندوستان اور اسرائیل کو ایٹمی اسلحہ کی تیاری پر درپردہ "شاباش" دیتا ہے اور پاکستان پر اسلامی بم بنانے کا الزام دھرتا ہے۔ فلسطینیوں کو اپنی سرپرستی میں گھر سے بے گھر کرواتا ہے اور انسان کی دھجیاں اڑاتا ہے روس کی عیسائی ریاستوں کو تحفظ اور مسلم ریاستوں کو گولی دیتا ہے بوسنیا کے مسلمانوں پر دانہ پانی بند کرتا ہے۔" (۱۱)

امریکہ اور اسرائیل عالم اسلام کے لیے ایک ناسور ہیں۔ اسرائیل اپنے آپ کو یہودی نظریاتی ریاست اور مغربی اقوام کے اتحادی ہونے کا موازنہ پاکستان کے ساتھ کرتا ہے، جس طرح پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے اور اسلامی دنیا میں اثر و رسوخ کے ساتھ ایٹمی قوت بھی رکھتی ہے۔ امریکہ کی طرح اسرائیل بھی اس بات سے بہت پریشان ہوتا ہے کہ کہیں اسلامی ممالک کے پاس جوہری طاقت نہ آجائے اسی لیے مغربی اقوام دن رات ایران کے خلاف پالیسیاں بنا کر پابندیاں عائد کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اسرائیلی وزیر اعظم کی سوچ اور تشویش کو شاہد نذیر اس طرح بیان کرتے ہیں:

"صیہونیت کی عالمی تحریک کو پاکستان میں قطعاً غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے درحقیقت پاکستان ہمارا نظریاتی اور حقیقی مد مقابل ہے۔ پاکستان جن راستوں پر چل رہا ہے وہ یہودیوں کے عالمی راج اور ایک مستقل ریاست کے لیے خطرہ ہے۔ پاکستان کا فکری اور جنگی و عسکری سرمایہ اور قوت ہمارے لیے کسی بھی وقت مصیبت بن سکتی ہے لہذا ہمیں اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ پاکستان کے خلاف ہمیں کیا کرنا ہو گا۔ بھارت کے ساتھ ہماری دوستی مضبوط اور مفید ہوگی، لہذا اس میں پاکستان اور بھارت کے تاریخی عناد سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔" (۱۲)

د۔ عالمی سیاست کے خلاف مزاحمت

وہ ہیر و شیماء، ویتنام ہو کہ بٹ مالو
کہیں بھی ظلم ہو آنکھ اشکبار اپنی ہو
یہی ہے فن کا تقاضا یہی مزاج اپنا ہو
متاعِ درد سبھی پر نثار اپنی ہو
(شب خون، ص ۱۶)

احمد فراز عالمی سیاست اور تاریخِ اقوام پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ وہ دورِ آمریت میں جلا وطنی اختیار کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔ ان کو مختلف ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا اور وہ مختلف ملکوں کے شعرا اور ادیبوں سے ملتے رہے خاص کر تیسری دنیا کے مقہور و مظلوم ممالک کے مقہور اور ستم رسیدہ شعرا کے ساتھ ان کا رشتہ مضبوط ہو گیا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ شعرا بھی عوام پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کر کے سختیوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہوں نے اس جلا وطنی کے دوران عالمی صورتِ حال کا گہرا مطالعہ کیا اور شاعری کی ضمن میں اپنے احساسات کا اظہار کرتے رہے۔ ان کی شاعری کا ایک حصہ عالمی سیاست پر مشتمل ہے۔ اس حصے کی شاعری میں بھی انہوں نے دیگر ملکوں میں ہونے والے انسان سوز واقعات کے خلاف بھرپور انداز میں اشعار لکھے ہیں۔

ان کی عالمی سیاست کے خلاف، مزاحمت و احتجاج پر مشتمل نظموں میں سے ایک نظم 'کالی دیوار' کے نام سے ہے۔ وہ بلارنگ، نسل و مذہب کے تمام انسانوں سے محبت کرنے والے شاعر تھے۔ دنیا کی کسی جگہ پر ظلم ہوا ہو یا مظالم کے آثار نظر آئیں یا کوئی دکھ بھرا منظر دکھائی دے تو فراز تڑپ کر اپنے احساسات و جذبات کا اظہار شاعری کے ذریعے کرتے تھے۔ دنیا کے المناک اور انسانیت سوز واقعات میں ایک ویتنام کی جنگ ہے۔ یہ جنگ بظاہر شمالی ویت نام اور جنوبی ویت نام کے درمیان لڑی گئی۔ شمالی اور جنوبی ویت نام کے حوالے سے عبداللہ طارق رکھتے ہیں:

۱۹۵۴ء ہند چینی کی پہلی جنگ کے اختتام پر ویت نام دو حصوں میں تقسیم تھا۔ شمالی کمیونسٹ حصہ ہو جی منہ کی زیر قیادت نو تشکیل شدہ ڈیموکریٹک ری پبلک آف ویت

نام پر مشتمل تھا جبکہ جنوبی حصہ فرانسیسی کٹھ پتلی وزیراعظم، سابق شہنشاہ باؤڈالی کی حکومت تھی۔" (۱۳)

انہوں نے اپنی نظم "کالی دیوار" میں ویتنام جنگ میں مارے جانے والے امریکی فوجیوں، امریکہ کی غلط پالیسی اور طاقت کے ناجائز استعمال کی مذمت کی ہے۔ اس نظم میں بلارنگ و نسل انسانیت کے قتل پر اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے جب ان امریکی فوجیوں کے عزیزوں کو دیوار پر کندہ ناموں کو دیکھ کر زار و قطار روتے اور آہوں اور سسکیوں سے مغموم فضا کو دیکھا تو بہت تکلیف دہ صورتِ حال سے گزرتے ہوئے یہ نظم لکھی۔ وہ اس جنگ کو مسلط کر کے بہت سے انسانوں کو قتل کروانے والی قوتوں اور زخم خوردہ بے بس ماؤں، بہنوں اور بیواؤں کی آہ و بکا کے دلخراش مناظر اپنے اشعار اور نظموں کے ذریعے دنیا کے سامنے بیان کرنا چاہتے تھے اس نظم کو لکھنے کا پس منظر یہ تھا کہ احمد فراز واشنگٹن کی سیر کرتے ہوئے اس دیوار کے قریب سے گزرے جہاں ویتنام جنگ میں مارے جانے والے امریکی فوجیوں کے نام کندہ تھے۔ اس نظم میں انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دنیا میں امریکہ والے امن اور انسانیت کا نعرہ بلند کرتے ہوئے بڑی منافقت سے کام لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے جتنے انسان قتل کیے یا کروائے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے اس نظم میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا میں امن کا ڈنڈور لپیٹنے والا امریکہ نے ویتنام جنگ میں ٹنوں اور منوں کے حساب سے بموں کا استعمال کر کے نہ صرف ویتنام کے باشندوں کا قتل عام کیا بلکہ ویتنام کو اپنی اور اتحادی ممالک کی فوجیوں کا قبرستان بنا دیا۔ انہوں نے کہا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا منافق اس سفید حویلی اور مضبوط قلعے میں رہتا ہے جو خود کو بڑی طاقت کا مالک سمجھ کر انسانوں اور غریب ملکوں کو تباہ و برباد کرنے میں شب و روز گزارتا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ دنیا میں کسی جگہ بھی بڑی سطح پر انسانیت کا قتل ہو یا اقوام و ممالک کا نقشہ تبدیل کر کے اپنی منشا کے مطابق بنانے کی کوشش وہاں امریکہ کا براہِ راست یا بالواسطہ کردار ہوتا ہے۔ بقول احمد فراز:

یہ ہیں یہ جادو گر بیٹھا جب کہیں کی ڈور ہلائے

یہ بستی ناگاساکی، ہیروشیما بن جائے

(کالی دیوار، خواب گل پریشان، ص ۸۵)

ہیر و شیم اور ناگاساکی میں کروڑوں انسانوں کو قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح ویتنام میں ہونی والی انسانیت سوز جنگ میں بھی امریکہ براہ راست ملوث تھا۔ اس بات کی وضاحت ہمیں طارق عبد اللہ کی تحریر میں ملتی ہے کہ ”۲۴ جنوری ۱۹۶۴ء کو ایم اے سی ون نے ویت نام میں سی آئی اے کی خفیہ کاروائیاں سنبھالنے کے لیے ایک خصوصی یونٹ سپیشل آپریشنز گروپ کے نام سے قائم کیا۔ عملاً یہ یونٹ ایم اے سی وی کی کمان میں تھا بلکہ براہ راست واشنگٹن میں جوائنٹ چیف آف سٹاف کو رپورٹ کرتا تھا۔“^(۱۴) احمد فراز نے امریکہ کی ایک اور سیاہ کاری اور منافقت سے پردہ اٹھایا۔ احمد فراز نے جب امریکہ کے صدور اور آقاؤں کی قیام گاہوں سے فاصلے پر کالی دیوار کے قرب و جوار میں لوگوں کی حالت دیکھی اور یہ بھی دیکھا کہ امریکیوں نے ایک پہاڑ، مونو منٹ بنا کر احمد فراز کے بقول چھوٹے چھوٹے نام کندہ کروا کر اسے شہدائے ویتنام کے نام کر دیا۔ انہوں نے اس منافقت اور پالیسی پر لعنت بھیجتے ہوئے کہا کہ ویتنام میں اتنی تعداد میں امریکی اور اتحادی فوجی ہلاک ہوئے ہیں اور امریکیوں نے ایک پہاڑ، مونو منٹ بنا کر ویتنام میں مارے جانے والوں کے نام لکھ کر عہدہ براہونے کی کوشش کی ہے۔ لیکن عین ممکن ہے کہ اس میں تمام فوجیوں کے نام بھی نہ ہوں۔ انہوں نے اس نظم میں حقیقت کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ اس نظم کو پڑھتے ہوئے تمام منظر ہمارے آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے کہ لوگ وہاں اشک بار آنکھوں کے ساتھ اپنے عزیزوں کے نام تلاش کر رہے تھے۔ احمد فراز نے وہاں کے لوگوں اور حکمرانوں سے احتجاجاً یہ سوال کیا ہے کہ تم نے اپنے پیاروں کو کس مقصد کے لیے گنوا دیا؟ ویتنام کو بارود اور بموں سے خاکستر کرنے کے بعد کیا کچھ حاصل کیا جاسکا؟ یقیناً اس کا جواب انسانی و عقلی بنیاد پر بالکل نفی میں ہے۔ انہوں نے اس دیوار کو دنیا کی ایک انوکھی دیوار قرار دیا ہے کہ یہ کالی دیوار ناموں کا قبرستان ہے۔ کسی تجزیہ نگار کا کہنا ہے کہ ایک دلچسپ حقیقت کے مطابق ۹۱ فیصد بالغ امریکی جس لفظ سے سب سے زیادہ خوف کھاتے ہیں وہ ویتنام ہے۔ وہ اس سے سنتے ہی چڑ جاتے ہیں اور امریکی میڈیا اس لفظ کے استعمال سے اجتناب برتتا ہے۔

احمد فراز نے یہ ”نظم کالی دیوار“، ایک دفعہ دہلی کے مشاعرے میں بھی سنائی توان کو بہت داد ملی۔ دہلی کے اس مشاعرے میں نظم سنانے اور ان کو ملنے والی داد کے بارے میں شمیم اکرام الحق لکھتی ہیں:

”۔۔۔ اس سے قطع نظر کہ کسی سے اس کا خون کا رشتہ ہے یا نہیں۔ وہ اس کا ہم وطن ہے یا نہیں، وہ انسان دوست شاعر تھا۔۔۔ دنیا بھر کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کے دکھوں میں پروتی ہوئی: واشنگٹن کی کالی دیوار دیکھ کر ”جیسی نظمیں بھی لکھتا ہے۔ دہلی

میں ایک بار غالب اکیڈمی کے مشاعرے میں فراز نے مذکورہ نظم سنائی تو ہال سے آوازیں بلند ہوئیں، آسام پر بھی کچھ لکھیے۔" (۱۵)

قیام پاکستان ایک اتفاقی امر نہیں تھا بلکہ اس نظریاتی ملک کو حاصل کرنے کے لیے مسلمان کئی صدیوں سے کوئی نہ کوئی قربانی دیتے چلے آ رہے تھے۔ جب آخری منزل تک یہ قوم پہنچی تو اس وقت احمد فراز کا فہم و شعور درک کر رہا تھا کہ یہ دنیا کی واحد نظریاتی مملکت ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں نے غیر معمولی قربانیاں دی ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی جان و مال یہاں تک کہ ناموس، عزت و آبرو پر بھی حملہ ہونے کے باوجود یہ عظیم مملکت حاصل کر لی ہے۔ ان کی یہ نظم شہدائے جنگ آزادی، ایک جذباتی کیفیت اور اعلیٰ طرز بیان پر مشتمل نظم ہے۔ اس نظم کی شہرت، ان کی ترقی پسند فکر اور معیار فن کی داد دیتے ہوئے احسان اکبریوں رقمطراز ہیں:

"۔۔ جنگ آزادی کے شہدا کی یاد آوری کے ناطے فراز نے جو نظم لکھی تھی اس کے تیور ہی اور تھے۔۔ ادب دوستوں کے روبرو لانے کے لیے بھی تو معیار درکار ہوتا ہے اور معیار فراز کے فن کو حاصل تھا۔ اس کے دشمن کو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ فراز کے پاس دولتِ فن موجود تھی۔ ایسا زِ خالص جو کسی بھی بازارِ ہنر میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔" (۱۶)

اس نظم میں انہوں نے سامراج کے ظلمت پرستوں کو للکارنے کے ساتھ ساتھ شہدائے جنگ آزادی کی سوچ اور شجاعت کو داد اور خراج تحسین پیش کیا ہے۔ انہوں نے مسلم قوم کی مسلسل جدوجہد اور ظلم کے خلاف بغاوت کا بہترین الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ باطل طاقتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہو کر اپنے سینوں پر گولیاں کھانے اور عظیم قربانی دینے والوں کی روحوں سے انتہائی عقیدت رکھتے ہوئے کہا ہے کہ جس آشیانے اور منزل کی بنیاد اُس پر آشوب دور میں رکھی تھی آپ کی قوم نے ان عظیم قربانیوں کو فراموش نہیں کیا ہے بلکہ جدوجہد اور قربانیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر اپنی منزل مقصود کو حاصل کر لیا۔ ایک سو سال کے بعد ہی سہی لیکن منزل تک رسائی حاصل کر لی گئی۔ بقول ان کے:

تم نے جس دن کے لیے اپنے جگر چاک کیے
سو برس بعد سہی، دن تو وہ آیا آخر
تم نے جس دشتِ تمنا کو لہو سے سینچا

ہم نے اس کو گل و گلزار بنایا آخر

(شہدائے جنگ آزادی، درد آشوب، ص ۱۷۴)

اس نظم میں انھوں نے ظلم و ستم اور طاغوتی قوتوں کے خلاف لباس کو کفن بنا کر ہر وقت صفِ اول میں رہنے والے سرفروشنوں کے کردار کو سراہا ہے۔

لیکن اے جذب مقدس کے شہیدانِ عظیم

کل کی ہار اپنے لیے جیت کی تمہید بنی

(شہدائے جنگ آزادی، درد آشوب، ص ۱۷۵)

وہ اس بات کا قائل ہے کہ اُس وقت مسلمانوں کو بظاہر شکست ہوئی لیکن وہ ناامید نہیں ہوئے۔ اس صدی میں مسلمانوں پر بہت سے مظالم ڈھائے جانے کے باوجود انہوں نے طاغوت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ انہوں نے انتہائی جذباتی کیفیت میں اُس وقت کے ظالم و جابر حکمرانوں کی روحوں اور ان کی اولادوں کو لٹکارتے ہوئے کہا ہے کہ تم نے حصولِ آزادی کے لیے آواز بلند کرنے والے باضمیر اور غیرت مند افراد کو ہر طرح کی سزائیں دلائیں، قید و بند کی خطرناک صعوبتوں سے گزارا تاکہ یہ قوم حصولِ آزادی سے باز رہے لیکن آخر کار مظلوم نے ہی کامیاب ہونا تھا اور ظلم مٹ جانا تھا سو ہم کامیاب ہو گئے۔ آج صرف ہم سرخرو نہیں ہوئے بلکہ ہمارے آباؤ اجداد کی رو حیں بھی شاد ماں ہیں۔

ہاتھ کٹتے رہے پر مشعلیں تابندہ رہیں

رسم جو تم سے چلی باعثِ تقلید بنی

شب کے سفاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو

جو کرنِ قتل ہوئی شعلہٗ خورشید بنی

(شہدائے جنگ آزادی، درد آشوب، ص ۱۷۶)

احمد فراز صرف فکری طور پر ہی ایک ترقی پسند نہ تھے بلکہ عملاً بھی سرگرم اور متحرک کارکن تھے۔ وہ ترقی پسند سوچ اور فکر کی بنیاد پر ہر طرح کی ناانصافی اور استحصال کے خلاف بولتے اور لکھتے رہے۔ ان کا کہنا ہے اے شہد آپ نے جن ظلمت پرستوں اور ستم کی نشان بلند کرنے والوں پر کاری ضرب لگائی تھی تو ہم نے بھی آپ کی تقلید کرتے ہوئے علم حق کو بلند کرنے کے ساتھ ظلم و استبداد کی دیواریں گرا دی ہیں۔

انہوں نے اس دور میں ہونے والے مظالم اور مجاہدین کی استقامت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ مجاہدین نے تختہ دار پر لٹکانے کے باوجود عزم و حوصلہ بلند رکھا۔ جس شمع کو فروزاں کر کے ہمیں راہ دکھائی گئی تھی ہم نے بھی اپنا خون دے کر اس دیے کو مدہم ہونے نہیں دیا اور دشمن کی خواہش اور مقاصد کو خاک میں ملا دیا۔

یہ سر بریدہ بدن ہے کس کا
یہ جامہ خوں کفن ہے کس کا
یہ زخم خوردہ ردا ہے کس کا
یہ پارہ پارہ صدا ہے کس کی
یہ کس لہو سے زمین یا قوت بن گئی ہے
یہ کس کے آغوش کا تابوت بن گئی ہے
(بیروت، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۰۲۳)

بیروت ملک لبنان کا دار الحکومت ہے۔ لبنان بنیادی طور پر مسلم اکثریت کا حامل ملک ہے لیکن مسیحی لوگ بھی اقلیت میں بستے ہیں۔ بیروت شہر نہ صرف خوبصورت اور تجارت کا مرکز تھا بلکہ کئی تہذیبوں کا مرکز بھی رہ چکا ہے اس سر زمین کو عالمی سیاست دانوں نے سیاسی جولان گاہ بناتے ہوئے تہہ وبالا کر دیا ہے۔ ملک کے مکین و زمین کو جولان گاہ سیاست بنا کر عالمی سیاست کے گھڑ سواروں نے تہہ وبالا کر دیا۔ وہ اپنی اس نظم میں بیروت میں کیے جانے والے ظلم و ستم کو شدت سے بیان کرتے ہوئے نوحہ خواں ہیں۔

احمد فراز نے بیروت کی صورت حال اور وہاں ہونے والی عالمی قوتوں کی سازشوں اور فتنوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے اسی نظم میں مسلم قوم اور مسلم حکمرانوں پر سخت اور درشت لہجے میں تنقید کی ہے۔

لبنان عالمی سیاست و سازش کا شکار ہو کر سلطنت عثمانیہ سے جدا ہو کر فرانس کا حصہ بن گیا۔ پہلے لبنان شام کا حصہ تھا۔ بعد میں مغربی مکاروں نے عجم و عرب اور مسلک کو ہوا دی اور ترک کے حکمرانوں کو مسند اقتدار سے زمین پر گرا دیا۔ مغربی سیاست کی لومڑیوں نے عرب کی عیش و آرام طلب قوم کو سبز باغ دکھاتے ہوئے اپنی طاقت کے بل پر ان کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کی۔ شام کو لبنان سے الگ کرنے اور وہاں پر

مسلمانوں کو یکسر نظر انداز کر کے مسیحوں کو اقتدار تک پہنچانے میں زیادہ تر کردار فرانس والوں کا رہا ہے۔ اسی موضوع اور سیاست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہد حسین رزاقی لکھتے ہیں:

"ترکوں کے عہدِ حکومت میں لبنان بھی شام کا ایک حصہ تھا لیکن فرانس نے شامی حریت پسندوں کی قوت توڑنے کے لیے لبنان کو شام سے الگ کر دیا تھا اور شام کو بھی کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔۔۔ فرانس نے ۱۹۲۵ء میں لبنان کو ایک عیسائی مملکت کی حیثیت سے الگ کر کے اس کا جُداگانہ نظم و نسق قائم کیا تھا۔۔۔" (۱۷)

مسلم اکثریت میں ہونے کے باوجود بھی فرانس اور دیگر مغربی طاقتوں نے مسیحی اقلیت کو اقتدار تک لانے کے لیے ایک خطرناک سازش اور مہم چلائی بد قسمتی سے وہ لوگ کامیاب بھی ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو فرقوں کی بنیاد پر تقسیم کرتے ہوئے شیعہ فرقے کو تیس فیصد جبکہ سنی فرقے کو ستائیس فیصد قرار دے کر اقتدار کی ڈور مسیحی اقلیت کے ہاتھ میں تنہا دی۔ ۱۹۳۲ء میں سازش کے تحت مردم شماری کر کے صدارت کا حق بھی مسیحوں کو دیا گیا۔ وزیر اعظم سنی مسلک اور سپیکر شیعہ مسلک کا نمائندہ ہونے کی پالیسی بنائی اور یہ پالیسی تاحال جاری ہے۔

انہی سازشی گروہوں نے بیروت میں خانہ جنگی کرائی۔ ۱۵ سال کے طویل عرصہ تک خانہ جنگی رہی اس جنگ میں لاکھوں لبنانی مرتے اور کٹتے رہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس قیامت خیز صورتِ حال کے دوران غاصب اسرائیل نے بھی ۱۹۸۲ء میں لبنان پر تقریباً دو مرتبہ حملہ کر کے لبنان کی گلی کو چوں کو انسانوں کے خون سے رنگین کر دیا۔ لبنان اور مسلمانوں پر اسرائیل حملوں اور اس ظلم کے خلاف فراز کے صدائے احتجاج بلند کرنے کے بارے میں قمر رئیس نے لکھا ہے کہ ”۱۹۸۲ء میں جب بیروت پر اسرائیلی حملے میں سینکڑوں فلسطینی مجاہدین شہید کر دیے گئے۔ اس کی گونج احمد فراز کی نظموں میں ملتی ہے۔“ (۱۸)

اسرائیل نے لبنان کے کچھ جنوبی حصے پر قبضہ کر لیا جب شام کی فوج لبنان میں تھی تو مغرب کے ساتھ اسرائیل نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ جب شامی فوجی انخلا کر چلی گئی تو اسرائیل اپنے فوجیوں کی اغواکاری کا ڈراما بنا کر ایک مرتبہ پھر لبنان پر حملہ آور ہوا اس دفعہ لبنان میں موجود تنظیم حزب اللہ کے مجاہدین نے مزاحمت کی اور پہلے سے قبضہ شدہ حصے کو بھی آزاد کرالیا۔

یہ کون بت آسرا ہیں
جو تیغ قاتلاں سے
کٹی ہوئی فصل کی طرح
جا بجا پڑے ہیں

(بیروت، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۰۲۳)

انہوں نے اس نظم میں وہاں ہزاروں کی تعداد میں مارنے جانے والے بے گناہوں کی گلی کو چوں میں پڑی ہوئی لاشوں کے منظر کو بیان کرتے ہوئے ان بکھری ہوئی لاشوں کو کٹی ہوئی فصلوں سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ زخموں سے چور بے بس و بے آسرا مظلوموں کی آوازیں جو مدہم ہوتی جا رہی ہیں کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ یہ بے یار و مددگار لوگ درد اور آہوں کے ساتھ سوئے عدم بڑھ رہے ہیں۔ کوئی انسان ان کی مدد کو نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ان کو جاننے ان کی شناخت بتانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔

یہ کس نگر کا سپوت ہیں
جو دیارِ انگار میں کھڑے ہیں

(بیروت، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۰۲۳)

فراز نے اس بات پر فخر کرتے ہوئے ان مجاہدوں کو دادِ شجاعت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ چند غازی اس آگ و خون کے میدان میں ثابت قدمی کے ساتھ اپنی قوم اور ملک کی خاطر حضرت ابراہیمؑ کی پیروی میں آگ کی بارشوں میں بھی باضمیر ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ انہوں نے اس نکتے کی جانب توجہ دلائی ہے کہ انہی چند باوفا سرفروشوں کی وجہ سے یہ ملک قائم رہا اگر ان کی طرف سے مزاحمت نہ ہوتی تو اس سرزمین پر غیر آکر آباد ہو جاتے۔ یہ اکثر ملکوں خاص کر تیسری دنیا میں دستور رہا ہے کہ چند باضمیر افراد جو اپنی مٹی کی خاطر اپنی جان، مال، عزت و آبرو قربان کرنے کے لیے ہر آن تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے ملک سلامت رہتا ہے کوئی آنچ نہیں آتی ورنہ باقی ضمیر فروش سیاستدان، کرپٹ لوگ ملک کو نوچ رہے ہوتے ہیں۔

احمد فراز نے بکھری ہوئی لاشوں کو کٹی ہوئی فصلوں سے تعبیر کر کے ان کی مظلومیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ کون معصوم و مظلوم ہے لبنانی والدین کے چشم و چراغ کو ظلمت کی تند و تیز اور سرخ آندھیاں دیے کی مانند بجھا رہی ہے۔ میدانِ ستم میں جابر اور ظالم کوئی مزاحمت کار نہ ہونے کی بنا پر خاموشی کے ساتھ لبنان کو

فروزاں کرنے والے چراغ بجھاتے جا رہے ہیں۔ اگر ان کا کوئی مددگار ہوتا یا مزاحمت کرتے تو اتنی آسانی کے ساتھ کوئی انہیں قتل نہ کر سکتا۔ مگر صد افسوس اس طرح نہیں ہے ان کو جانے ان کی شناخت کے بارے میں کوئی بتانے والا بھی نہیں ہے۔ اس نظم میں انہوں نے عرب کے عیش و نوش میں مگن مغرب نوازوں پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اے شیوخ عرب یہ بڑی آزمائش تھی اس امتحان میں تم ناکام ہوئے۔ اپنی قوم پر ٹوٹنے والی قیامت پر نہ صرف ان کو بے آسرا بنادیا، بلکہ ظلم و جبر کرنے والے ظالموں اور جابروں کا حوصلہ بڑھانے میں تمہاری چپ اور خاموشی شامل ہے۔

محل سراوں میں خوش مقدر شیوخ چُپ

بادشاہ چپ ہیں

حرم کے سب پاسباں

عالم پناہ چُپ ہیں

منافقوں کے گروہ کے سربراہ چپ ہیں

تمام اہلِ ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے

لا الہ چپ ہیں

(بیروت، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۰۲۴)

انہوں نے اس نظم میں تین طبقوں کی مذمت کی ہے پہلا طبقہ عیش و نوش اور مزین محلات میں کنیزوں کی جھرمٹ میں خوش و خرم رہنے والے شیوخ عرب ہیں۔ جو تیل جیسی دولت کے مالک لیکن دولتِ انسانیت سے تہی دست ہیں ان کو مصلحت پسند اور مغربی غلامی کے سائے تلے عافیت کی اُمید رکھنے والے بزدل پاسباں حرم قرار دے کر ان پر لعن طعن کیا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اپنے آپ کو مہذب اور انسان دوست سمجھتا ہے امنِ عالم کا محافظ اور منصوبہ ساز ہونے کا نعرہ لگاتے نہیں تھکتا یعنی امریکہ۔ احمد فراز نے اس طبقے کو ورنیس المنافق کہتے ہوئے مذمت کی ہے۔ تیسرا طبقہ دنیا کے ریاکار مذہبی لوگوں کو قرار دے کر ان کی خاموشی کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم پر سکوت اختیار کرنے اور خاموش رہنے والے مذہبی رہنما جو کچھ کرتے ہیں تو محض دکھاوے اور درحقیقت درہم و دینار کے لیے کرتے ہیں۔

سلامتی کو نسل اقوام متحدہ کا دوسرا بڑا ادارہ اور ذیلی شاخ ہے۔ اقوام متحدہ کی تنظیم جنگ عظیم دوم کے بعد بنی۔ اقوام متحدہ کے منشور و پالیسی بظاہر انسانی حقوق کی بازیابی اور اقوام کی آزادی پر مشتمل ہے لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ اقوام متحدہ کے منشور اور پالیسی کے حوالے سے شاہد حسین رزاقی لکھتے ہیں:

"اس ادارہ کے بنیادی مقاصد یہ ہیں کہ آنے والی نسلوں کو جنگ کے مصائب سے محفوظ رکھا جائے۔ انسان کے اساسی حقوق کا احترام کیا جائے اور انصاف اور بین الاقوامی معاہدوں اور ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ دوسری اقوام سے دوستانہ تعلقات قائم کریں گی۔۔۔" (۱۹)

پھر چلے ہیں مرے زخموں کا مداوا کرنے
میرے غمخوار اُسی فتنہ گرِ دہر کے پاس
جس کی دہلیز پہ ٹپکی ہیں لہو کی بوندیں
(سلامتی کو نسل، نایافت، ص ۵۰)

احمد فراز نے اپنی نظم میں اقوام متحدہ کو دنیا کا سب سے بڑا فتنہ گر کہا ہے۔ وہ اُن تمام مظلوم و محکوم ممالک اور لوگوں کے اس عمل، حرکت اور سوچ سے نالاں ہے کہ جو اپنے اوپر ہونے والی مظالم اور حق تلفی کے مسائل حل کرنے کے لیے اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے زخموں کے مداوے اور انصاف کی خاطر نا سمجھی کے ساتھ اس طرف جارہے ہیں جہاں سے انسانوں کو گزند پہنچانے کا حکم دیا جاتا ہے اور اس کی دہلیز پہ معصوم اور بے گناہوں کے خون سے سرخ ہے۔

کون اس قتل گہرِ ناز کے سمجھے اسرار
جس نے ہر دشمن کو پھولوں میں چھپا رکھا ہے

یہاں قاتل کے طرف دار ہیں سارے قاتل
کاہشِ دیدہ پُر خوں کا صلہ کچھ نہ ملا
(سلامتی کو نسل، نایافت، ص ۵۱)

انہوں نے سلامتی کو نسل سے رجوع کرنے سے سخت اختلاف کیا ہے۔ وہاں دادخواہی کی خاطر جانے والوں کو اس قصر کے اسرار کو جاننے اور آگہی حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔ وہ اس بات اور حقیقت کو سمجھانے پر

مصر نظر آتے ہیں کہ وہاں زخموں پر مرہم رکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ سب زخموں پر نمک پاشی کرنے والے ہیں اس قتل گاہ کی جانب قدم بڑھا کر قاتلوں سے انصاف کا تقاضا کرنا عبث ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں ایسے ماہر قاتل بیٹھے ہوتے ہیں جو زہر کو غسل بنا کر دیگر اقوام و ممالک میں بیچ رہے ہوتے ہیں۔ امن کے منشور اور پالیسیاں با اہتمام پیش کرنے والے انسانوں کو کبھی عقوبت خانوں میں سسکتا چھوڑ دیتے ہیں، کہیں داروسن کی نذر کرتے ہیں تو کہیں جدید اسلحوں کے زد میں لا کر مروا رہے ہیں۔ انہوں نے انہی قصروں میں بیٹھنے والوں کی منافقت اور اعلان و عمل میں پائے جانے والے تضادات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس گروہ منافق کی طرف سے ملنے والے احکامات کے تحت مختلف ممالک کے باشندوں کو ابدی نیند سلانے اور ظلم کی انتہا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

امن کی فاختہ اڑاتی ہے نشان پر لیکن
نسل انسان کو صلیبوں پر چڑھا رکھا ہے
اس طرف نطق کی بارانِ کرم اور ادھر
کاسہ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے
(سلامتی کو نسل، نایافت، ص ۵۱)

دنیا کو جہنم نما بنانے والوں اور ملکوں کو تقسیم کر کے اپنی حکومت و حکمرانی کو وسعت دینے کے لیے کمین گاہوں میں بیٹھنے والے ان سفاکوں کے بارے میں کسی شاعر نے جامع اور مختصر انداز میں ایک خوبصورت شعر کہا ہے:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُرد چند
بہر تقسیم قبور انجمن ساختہ اند
(نامعلوم)

احمد فراز وہ واحد شاعر ہے جس نے کشمیر کی حمایت میں نہ صرف نظمیں لکھی ہیں بلکہ کشمیر میں لڑی جانے والی جنگ میں عملی طور پر بھی شریک ہوئے۔ ان کی کشمیر سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ زمانہ طالب علمی میں جب کشمیر میں حالات کشیدہ تھے تو فرسٹ ایئر کے طالب علم فراز نے فرسٹ ایڈ کی تربیت حاصل کی اور رضا کارانہ طور پر کشمیر کی سرحد اور محاذ پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ نے جب احمد فراز سے انٹرویو لیا تو احمد

فراز نے کہا: ”میں جہادِ کشمیر میں عملی طور پر شامل رہا ہوں۔ میں نے صرف کشمیر کی تحریک آزادی اور بے بس عوام پر نظمیں ہی نہیں کہی ہیں بلکہ میں اس جدوجہد میں ان کے ساتھ شریک رہا ہوں۔“ (۲۰)

دوسری بات یہ کہ جب احمد فراز پشاور یونیورسٹی سے ایم اے کر رہے تھے تو ان کے ساتھ کشمیر کا ایک طالب علم بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو رہا تھا۔ اس کا نام مقبول بٹ تھا۔ مقبول بٹ کو کشمیر جہاد کی تاریخ میں بہت شہرت ملی ہے وہ ان کا کلاس فیلو تھا۔ مقبول بٹ تحریک آزادی کشمیر کی میں پیش پیش رہنے کی وجہ سے گرفتار ہوا اور بھارت نے اسے پھانسی دی۔

احمد فراز نے کشمیر پر کئی نظمیں لکھی ہیں ان میں سے ایک نظم ”نیا کشمیر“ کے عنوان سے موجود ہے اس نظم میں انھوں نے کشمیر کے حسن و خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس حسین وادی کو جہنم میں تبدیل کرنے والے عناصر، غربت و افلاس اور وہاں پر ہونے والے شہادتوں کا ذکر کیا ہے

تیرے سینے پہ محلات کے ناسوروں نے
تیری شریانوں میں اک زہر سا بھرا رکھا ہے
تیرا ماحول تو جنت سے حسیں تر ہے مگر
تجھ کو دوزخ سے سے سوا وقت نے کر رکھا ہے
تجھ کو غیروں نے سدا دست نگر رکھا ہے

(نیا کشمیر، شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۶۱)

پاکستان کی تاریخ میں مسئلہ کشمیر ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ آج تک اس مسئلے پر ملکی اور بین الاقوامی سطح پر سازش اور سیاست ہوتی چلی آرہی ہے۔ کشمیر ایشیوپرینڈت نہرو اور قائد اعظم نے مشترکہ طور پر کشمیر کے عوام کو تین آپشن اور حق دیے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ عوام کی رائے کو محور مرکز قرار دیا جائے۔ اگر عوام کی کثرتِ رائے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں فیصلہ کرے تو یہ پاکستان کا حصہ شمار ہوگا۔ دوسرا یہ ہے کہ اگر کثرتِ رائے بھارت سے الحاق کے حق میں فیصلہ کرے تو یہ بھارت کا حصہ تصور ہوگا۔ تیسرا حق یہ دیا گیا ہے کہ اگر کثرتِ رائے کا تقاضا الگ آزاد ریاست کا قیام ہو تو ان کو الگ ریاست کا حق دے دیا جائے گا۔ لیکن مشکل امر یہ ہے کہ کشمیر کے عوام خود منقسم ہیں۔ کوئی پاکستان کے ساتھ الحاق کا نعرہ بلند کرتا نظر آتا ہے تو کوئی آزاد ریاست کی خواہش کی بنا پر جدوجہد جاری رکھنے کا عزم رکھتا ہے اور کچھ تو بھارت کا حصہ بننے کے حق میں نظر آتے ہیں۔ مسئلہ

کشمیر پر عالمی سطح پر سازش اور سیاست ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انڈیا نے کشمیر پر ناحق قبضہ کر لیا۔ بھارت نے صرف کشمیر پر قبضہ کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ظلم و ستم کے تمام طریقے آزماتا رہا۔ مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کا جھنڈا لہرانے اور پاکستان کے حق میں آواز بلند کرنے والوں پر خطرناک ظلم و ستم جاری رکھا گیا ہے۔ بہت سی ماؤں کے لختِ جگر اس مقتلِ گاہ سے واپس گھر نہیں پہنچے۔

پاکستان کی حکومت نے کچھ آزاد علاقوں کو اس مسئلے کے ساتھ معلق و منسلک کر دیا۔ ان علاقوں کے باشندے اپنے زور بازو سے قیام پاکستان کے ایک سال بعد آزادی حاصل کر کے پاکستان کا حصہ بننے کی شدید خواہش کرتے ہوئے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر چکے تھے۔ لیکن ایک منظم پالیسی اور سازش کے تحت اس مخلصانہ الحاق کو نظر انداز کر دیا گیا۔ نئی تعلیم یافتہ نسل کے درمیان اس اعلانِ الحاق اور بعد میں اس کے خلاف کی جانے والی سازشوں کے بارے میں دن بدن شدت سے بحث ہوتی چلی آرہی ہے۔ اگر ان باشندوں کی قربانیوں اور جغرافیائی حیثیت سے وسعت کے باوجود ان علاقوں پر ملکی سازش و سیاست اور غیر ملکی دباؤ کے تحت دھندلی ہوئی فضا قائم رہی تو مملکتِ پاکستان کے لیے مستقبل میں مزید مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔

اس نظم میں انہوں نے بین الاقوامی سازشی عناصر کے علاوہ ہمارے سیاست دانوں کو بھی کشمیر کے مسئلے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ملکی سطح پر کوئی سنجیدہ قدم نہ اٹھانے اور ریاستی سطح پر اس مسئلے کے حوالے سے پاکستان کے کردار کی حقیقت اس نظم کے مفہوم سے واضح ہوتی ہے۔ جاوید اختر پاشا اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسئلہ کشمیر ایک حقیقت ہے۔ ہماری اپنی بقا کے ساتھ ساتھ امنِ عالم کے لیے یہ ایک

مسئلہ بن سکتا ہے۔ لیکن ہمیں خود صحیح طور پر آگاہ ہی نہیں کہ ہم نے اس مسئلہ کو کب،

کہاں اور کس طرح پیش کرتا ہے تو پھر شکایت کیسی؟" (۲۱)

کشمیر کا مسئلہ حل نہ کرنے کی وجہ سے اور اس میں شدت آنے سے مغربی ممالک کو اچھا خاصا فائدہ ہوتا ہے۔ اولاً تو اس مسئلے کی شدت سے ہر وقت جنگی صورتِ حال رہتی ہے۔ اس لیے ان ممالک کے جنگی ساز و سامان اور اشیاءِ مہنگے داموں بکتی ہیں۔ ثانیاً پاکستان اور بھارت ہر وقت کشیدگی رہنے سے یہاں ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ مسئلہ کشمیر قیام پاکستان کے وقت سے عالمی مکاروں کے زیرِ اثر رہا ہے۔ اس مسئلے پر عالمی سازش و سیاست کے بارے میں طارق مجید لکھتے ہیں:

۱۹۶۲ء کی انڈیا-چین جنگ میں جب انڈین فوج پسپا ہو رہی تھی اور پاکستان فوری پیش قدمی کر کے مقبوضہ کشمیر میں اہم فوجی فائدہ اٹھانے کے لیے تیار تھا تا کہ اس کے بعد انڈیا کے لیے مسئلہ کشمیر حل کرنا لازمی ہو جائے، تو امریکہ نے پاکستان کو پیش قدمی سے روک دیا۔ یہ ضمانت دے کر کہ جنگ کے بعد امریکہ خود انڈیا کو مسئلہ کشمیر کے تصفیے پر مجبور کرے گا لیکن یہ دھوکا ثابت ہوا۔^{۱۱} (۲۲)

احمد فرازان تمام مظالم کے باوجود ناامید نہیں ہیں اور پھر سے کشمیر کے وادی گل و گلزار بننے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اس جنت نظیر سرزمین کے اطراف ہر جگہ شعلے ہی شعلے بھڑکتے نظر آتے ہیں۔ احمد فرازان نے اس وادی میں رہنے والوں کی زندگی وغیرہ کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے کشمیر میں ہونے والے دہشت و بربریت کے حقائق کے بارے میں بتایا ہے کہ اس حسین وادی کے شباب کی رعنائیوں کو ختم کرنے میں بین الاقوامی طاقتیں، شاہی ایوانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ، ریاست کے خیانت کار اور چند مقامی منافق شامل ہیں۔ نیز ان کی سیاہ کاریوں کی وجہ سے آگ اور خون کا نہ تھمنے والا سلسلہ جاری ہے۔

انقلابات نئے دور ہیں لانے والے
حشر اٹھانے کو ہیں اب ظلم کے ایوانوں میں

پھر تجھے ہیں گل و گلزار بنانے والے
(نیا کشمیر، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۶۱۸)

احمد فرازان اس نظم میں ظلم کرنے والوں کا انجام دیکھنے کی خواہش رکھتے ہوئے نئی نسل سے امید و توقع رکھتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اس نظم میں صرف ظلم و جبر کی مذمت نہیں کی ہے بلکہ لوگوں کے عزم، حوصلے اور قربانی دینے کے جذبے کو سراہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب انسان ڈسا جاتا ہے تو موت کی وادی کی طرف سفر تیز تر ہوتا ہے۔ اسی طرح وہاں کے جوان آئے دن جام شہادت نوش کرتے ہیں اور اپنے گلستان کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتے ہوئے دشمن کی چال ناکام بنا رہے ہیں۔ ڈسے جانے والے انسان کو جب تریاق میسر ہو تو کچھ علاج ممکن ہوتا ہے۔ اب اس وادی کے سرفروشوں کا تریاق فکرِ حریت اور جذبہ آزادی ہے۔ جب بھی

دُشمن کی طرف سے کسی مجاہد کو زخم لگتے ہیں تو وہ ان کے مندرجہ ہونے کا انتظار نہیں کرتا بلکہ اس کی استقامت اور شوق شہادت کے جذبے میں شدت آجاتی ہے۔

انہوں نے اُن نادیدہ قوتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جو مقبوضہ وادی میں جذبات سے سرشار باشندوں کی تحریک آزادی کو ختم کرنے، جذبہ حریت کو مٹانے اور جدوجہد کی اس عظیم راہ سے ہٹانے کے لیے مختلف حربے استعمال کر رہی ہیں اور وہاں غربت، بھوک، افلاس اور فقر و فاقہ کی کیفیت برپا کر رکھی ہیں۔

قحط و افلاس کے گرداب میں غرقاب عوام

جن سے تقدیر کے ساحل بھی برا فرختہ ہیں

سالہا سال سے لب بستہ زبان دوختہ ہیں

(نیا کشمیر، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۶۱۸)

وہاں پر بسنے والوں کے لیے گویا یہ شرط رکھی گئی تھی کہ بقائے حیات کے لیے صرف سانس لے کر اپنی زندگی کی رمت اور نشانی باقی رکھیں اور کوئی بھی سر اٹھا کر نہ جیے اور نہ ہی جینے کا حوصلہ کرے۔ ان کا کہنا ہے کہ نئے دور نئے زمانے کے ساتھ جو نسل آرہی ہے۔ یہ اس انقلاب کو اس جدوجہد کو منطقی انجام تک پہنچائے گی۔

۵۔ نظریہ جمہوریت اور آمریت کی ابتدا

مصور پاکستان علامہ محمد اقبال نے جس اسلامی و جمہوری مملکت کا خواب دیکھا تھا اس خواب کو قائد اعظم محمد علی جناح نے جمہوری طاقت کے ذریعے شرمندہ تعبیر کیا۔ فراز اس مملکت کی نگہبانی و پاسبانی کو اپنا فرض سمجھتے تھے اور اس پر فخر محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اس اسلامی و جمہوری مملکت کا تصور پیش کرنے والی شخصیت کا نظریہ دل سے تسلیم کرتے ہوئے اس پر قائم رہنے کے لیے علامہ اقبال کی تبعیت و پیروی میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اس طرح پیش کیا تھا:

وہ بھی شاعر تھا تجھے تخلیق کیا

میں بھی شاعر ہوں تو خون دے سنواروں گا تجھے

(شب خون، ص ۱۵)

فراز جمہوریت پسند شاعر تھے انہوں نے ابتدا ہی میں شعوری طور پر اپنی راہ اور فن کے استعمال اور تشخص کو بیان کر دیا تھا۔ وہ آزاد اور روشن فکر کے سبب ہر وقت آزادی کی بات کرتے تھے اور پابندی میں ان کا

دم گھٹتا رہا۔ فراز کی جمہوری سوچ اور فکر کے بارے میں خورشید بیگ میلسوی لکھتے ہیں: ”وہ جمہوریت پسند شاعر تھے اس لیے وقت کے آمر نے ایک نظم لکھنے کی پاداش میں انہیں جیل میں ڈال دیا۔ لیکن وہ ان کی شاعری کو قید نہ کر سکا۔“ (۲۳)

دنیا کا ہر روشن ضمیر انسان فطری تقاضوں کی بنیاد پر آزادی کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آزادی کو ہر کسی کا فطری حق تسلیم کرتا ہے۔ وہ ہر طرح کے غیر انسانی قدم اٹھانے سے گریز کرتا ہے۔ بنیادی طور پر انسان فاعل مختار ہے۔ وہ اپنا فعل و عمل غرض ہر چیز اپنی قوت و اختیار کے ساتھ کر سکتا ہے لیکن بعض عوامل ایسے در آتے ہیں جو اس راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اس میں ماحول کا اثر، تربیت کا فقدان، عدم علم اور خواہشات وغیرہ کا فرما ہوتے ہیں۔ ہر فرد اور ہر شخص انسانیت کے ناطے برابر ہے۔ لیکن جدید دور میں خصوصاً ترقی پذیر ممالک میں کئی عوامل اکٹھے ہو کر اس فطری حق خود مختاری اور آزادی کی راہ کو مسدود کر کے مساویانہ تصور کو ختم کر دیتے ہیں۔ ان عوامل میں غربت، جہالت، نسل پرستی اور لسانی تعصب وغیرہ شامل ہیں۔ آمریت جمہوریت کا تضاد ہے یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں وجودی ہیں۔ نقیضین کی طرح نہیں ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کی تاریخ پر نگاہ کی جائے تو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ کہیں کہیں ظاہری جمہوریت بھی دولت و طاقت کے سایے میں چل رہی ہوتی ہے۔ عام طور پر طاقتور ہی حکمرانی کرتا چلا آ رہا ہے۔ جمہوری نظام میں ملک و عوام کو اگر فائدہ نہ مل سکا تو وہ کسی گزند سے تو محفوظ رہ سکتے ہیں۔ کوئی بھی شخص آزادی کے ساتھ سوچ اور بول سکتا ہے۔ اپنے مافی الضمیر احساسات و جذبات کا اظہار کر سکتا ہے لیکن دور آمریت میں پابندی ہوتی ہے۔ دور آمریت میں مخالفت و مزاحمت کرنے کے لیے باضمیر اور حوصلہ مند اور جرات مند افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مملکت خداداد پاکستان جمہوری عمل کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس بستی کی تقدیر میں جمہوریت کا زمانہ کم جبکہ آمریت کا حصہ زیادہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے بعد آزادی حاصل کرنے والے ممالک ترقی کی راہ میں پاکستان سے کہیں زیادہ آگے نکل چکے ہیں۔ جمہوریت اور آمریت دونوں کی تعریف اور موازنہ کرتے ہوئے سید محمد مظفر جو ملک کے وزیر قانون بھی رہ چکے ہیں، لکھتے ہیں:

”جمہوریت ایک مذہب ہے۔ ڈکٹیٹر شپ، جاہلیت ہے۔ جمہوریت، مثبت ہے، ڈکٹیٹر

شب تاریکی ہے۔ جمہوریت روشنی ہے، ڈکٹیٹر تاریکی ہے“ (۲۴)

و۔ آمریت کی ابتدا

آمریت، استبداد اور استحصال کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں جیسے فرعون، نمرود اور یزید وغیرہ جنہوں نے اپنی فوج اور لشکر کی طاقت سے نہ صرف اقتدار کی بھاگ دوڑ سنبھالی بلکہ رعایا و عوام پر ظلم و ستم کے دروازے وا کر کے خدائی تک کا دعویٰ کر بیٹھے۔ آمریت اور جمہوریت کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو روم کی تاریخ میں یہ بات ملتی ہے کہ وہاں پر جمہوریت اور آمریت دونوں کی تاریخ موجود ہے لیکن اُس وقت آمریت کا قیام مجبوری کے تحت ہوتا تھا۔ اُس دور میں جب کہیں جمہوری نظام میں خلل ڈال کر بغاوت یا علیحدگی کی باتیں اور تحریکیں اُٹھتیں تو آمریت کا نظام چلانے کی نوبت آ جاتی تھی اور آمر کو زمام اقتدار دے کر پوری طاقت کے ساتھ اس بغاوت کی فضا اور ماحول کو کچل کر ختم کرنے کا ٹاسک دیا جاتا تھا۔ لیکن اُس وقت کی آمریت جدید آمریت کی طرح نہیں تھی۔ آج کی آمریت کو غیر متوقع طور پر اقتدار تک رسائی ہو جائے تو وہ تاحیات اقتدار کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی خواہش رکھتی ہے۔ وہ اپنی کُرسی اور اقتدار کو طول دینے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانے سے نہیں کتراتی۔ اس دور میں جب آمریت کے لیے کام کرنے کی ذمہ داری دی جاتی تھی تو ایک منظم پالیسی کے تحت یہ ذمہ داری دی جاتی تھی اور معین مدت کے لیے یہ کام یعنی نظام اس کے حوالہ کیا جاتا تھا۔ اس مدت کے بعد لازماً جمہوری نظام نافذ ہوتا تھا۔ اس دور یعنی آمریت کی ابتدا کے بارے میں سید مظفر لکھتے ہیں:

"سینٹ کے مقرر کردہ ڈکٹیٹر کو سات سال کے لیے بڑے وسیع اختیارات دیے جاتے تھے، پھر جب سات سال کی مدت ختم ہو جاتی تو اس کے ساتھ ہی ڈکٹیٹر کے اختیارات بھی از خود ختم ہو جاتے اور اپنے عہدے سے لازماً دستبردار ہونا پڑتا اس کے ساتھ ہنگامی حالات بھی ختم کرنے پڑتے اور ایک آئینی حکومت کو بحال کر دیا جاتا۔" (۲۵)

ز۔ آمریت کے خلاف مزاحمت

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فراز تھا ظالم سے چپ رہا نہ گیا
(جاناں جاناں، ص ۱۹)

یہ شعر احمد فراز کے ہر دور اور وقت کے نعرے اور منشور کے اعلان پر مشتمل ہے۔ آپ تمام دورِ آمریت میں آمروں کے غیر آئینی اقدامات کی مخالفت کرتے ہوئے ان کے خلاف بلاخوف و خطر آواز اٹھاتے رہے۔ انھوں نے محکوم طبقوں کی حمایت اور جابر و حاکم طبقوں کی مخالفت میں صدائے احتجاج اس وقت بلند کی جب زمانے میں گنے چنے اہل قلم کے علاوہ سب مصلحتوں کی زمین آباد کرتے ہوئے رمز و کنایوں کے ضمن میں اپنے محسوسات و خیالات لکھتے ہوئے منصبِ شاعری سے وفاداری اور وقت کے حکمرانوں کی سزا وغیرہ سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس دورِ پُرفتن میں شعر اور ادیبوں کی خاموشی لیکین فراز، فیض اور جالب کے احتجاج کرنے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے محبوب ظفر لکھتے ہیں:

"عہدِ جبر میں بہت ساری آوازیں یا تو خاموش ہو جاتی ہیں یا مدہم پڑ جاتی ہیں کیوں کہ اُس عہد میں بولنا اور اونچی آواز میں بولنا گناہ قرار دیا جاتا ہے۔ ہمارے عہد میں فیض احمد فیض اور حبیب جالب کے بعد احمد فراز ہی ایک ایسا شاعر نظر آتا ہے، جس نے ہر عہد میں آواز حق بلند کی ہے۔" (۲۶)

وہ ابتدا ہی سے جمہوریت کی حمایت کرتے اور ملک لوٹنے والوں کے خلاف لکھ رہے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ صرف اور صرف رومانویت کا شاعر ہے اور ان کے ہاں رومانویت کے علاوہ کوئی خاص پہلو نہیں ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کی شاعری میں رومانویت کا پہلو غالب ہے لیکن ان کی شاعری میں مزاحمت کا پہلو بھی موجود ہے۔ اس بات کی بڑی دلیل خود احمد فراز کی باتیں ہیں۔ جب شاہد ندیم نے ان سے انٹرویو لیتے ہوئے سوال کیا کہ لوگ عام طور پر 'اب کے پچھڑے والے' رومانی شاعر کو "پیشہ ور قاتلو" اور "محاصرہ" والے انقلابی باغی شاعر میں بدلتے دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ اس سوال کے جواب کو شاہد ندیم اس طرح نقل کرتے ہیں:

فراز: مجھے شبہ ہوتا ہے کہ انہوں نے میری شاعری کو سنجیدگی سے نہیں پڑھا میرے پہلے مجموعے "تنہا تنہا" کی پہلی نظم "شاعر" میری پوزیشن کی وضاحت کرتی ہے اور غم ذات کو غم دنیا سے منسلک کرتی ہے اس نظم کا شاعر اپنا فن عوام کے لیے وقف کرتا ہے اور اُس وقت سے ہی یہی میرا منشور رہا ہے۔" (۲۷)

احمد فراز کی شاعری میں ابتدا میں ہی مزاحمت کا رنگ موجود تھا۔ ان کی شاعری میں مزاحمتی پہلو کو ان کے پہلے شعری مجموعہ "تنہا تنہا" میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً ان کی نظم "شاعر" میں یہ جھلک نظر آتی ہے۔ اسی موضوع کے حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک نے لکھا ہے کہ "ان کے پہلے مجموعہ کلام "تنہا تنہا" کی پہلی نظم "شاعر" گویا ان کی انقلابی شاعری کا منشور ہے۔" (۲۸)

تیسری دلیل یہ ہے کہ احمد فراز اُس وقت یقیناً عہدِ شباب کے احساسات و جذبات کا اظہار زیادہ کر رہے تھے لیکن مزاحمت کی طرف انہوں نے شعوری قدم رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ اب میری شاعری میں غم جاناں کے ساتھ غمِ دوراں بھی شامل ہوگا۔ ان کے بقول:

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو
نشہ بڑھتا ہے شرایں شرابوں میں ملیں
(درد آشوب، ص ۲۱۵)

انہوں نے اپنی نظم "شاعر" کے اشعار کے ذریعے اس فن کو بے مقصد اور بے جا استعمال کرنے کے خلاف لکھتے ہوئے آمریت نوازوں کا جمہوریت نوازوں کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اہل قلم کے حقائق لکھنے سے گریزاں رہنے کی وجہ بھی بتا دی ہے۔

بُھرا ابھی اگر دل میں کوئی جذبہ سرکش
اس خوف سے چپ تھا کہ کوئی ہونٹ نہ سی دے
(تنہا تنہا، ص ۲۴)

یہ فن بادشاہوں کی تعریف، ایوانوں اور مسندِ اقتدار پر براجمان حاکمِ دوراں کی مدح و ثنا کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ اس عظیم فطری صلاحیت، قوت اور آواز یعنی شاعری کو بعض ضمیر فروش زرو جواہر اور دولت کی خاطر خاک و گرد میں پلید کر کے ضمیر مردہ ہو کر سواد گری کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان قلم فروشوں کو حاکمِ دوراں کی تعریف کرنے کے عوض منصب و مراعات ملتی تھیں۔ اگر کوئی باضمیر انسان زندہ ضمیری و پامردی کے ساتھ وقت کے خداؤں کی تاریخ، قول و عمل اور کردار زیرِ قلم لاتا تو قلم اٹھانے اور سلسلہ روزگار و سے نہ صرف محروم ہو جاتا بلکہ اُسے موت کا پروانہ مل جاتا۔

ایوانوں کی توصیف و ثنا اوجِ عمل تھی
 اور اس کے عوض لعل و جواہر مجھے ملتے
 ورنہ مرا انعام فقط تیغِ اجل تھی
 (شاعر، تہاتہا، ص ۲۳)

تاریخ ان حقائق سے بھری ہوئی ہے کہ بادشاہِ وقت کے قصیدے لکھنے والوں پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی ہے جبکہ اس کی مخالفت میں قلم اٹھانے والوں پر دُرے اور کوڑوں کی بارش ہوتی ہے۔ شیخ سعدی شیرازی بھی وقت کے حاکم کی تعریف کیے بغیر اپنی شاعری اور نثری اثاثوں کو محفوظ نہ کر سکے۔ ابن سکیت کو خلیفہ وقت نے اپنی اولاد کی تعریف نہ کرنے پر شہید کر دیا گیا۔

اہل دانش کے دل میں کہیں سے بھی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا جذبہ بھی اگر پیدا ہو جائے تو یہ لوگ دو جوہات کی بنا پر احتیاط کرتے ہیں۔ اول تو اس خوف و ڈر سے خاموش رہتے ہیں کہ کہیں ان کی زبان بندی کا حکم نہ دے دیا جائے۔ دوسرا کہیں انہیں ملازمت سے محروم نہ کر دیا جائے۔

جب انسان ظلم و ستم سے نالاں اور تنگ آجاتا ہے تو جان کی فکر کیے بغیر ظالم کے گریبان تک ہاتھ بڑھاتا ہے۔ ایسے لوگ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترتے ہیں۔ مظلوم جب جذبہ بغاوت کے ساتھ حرکت کرتے ہیں تو تمام خوف و ہراس کی بنائی ہوئی دیواروں کو گرا کر پوری قوت و جذبے کے ساتھ نکلتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں تخت نشینوں کو زیر کر کے خس و خاشاک کی طرح بہادینا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ احمد فراز خود ادب برائے زندگی کے قائل تھے، ساتھ ہی اس نظریے کو اپنا کر چلنے کا مشورہ دیتے تھے۔

انھوں نے بلا خوف و ہراس نادیدہ قوتوں کی طرف سے کیے جانے والے مظالم اور سزاؤں سے بالاتر ہو کر لکھنے، رزم گاہوں میں عدو کو لٹکانے اور کسی بھی قیمت پر ان کے نظریات سے اختلاف جاری رکھنے کا عزم کر رکھا تھا۔ ان کو اس بات کا علم تھا کہ کہ آمر اپنی کرسی کو بچانے اور اپنی مخالفت میں اٹھنے والی آوازوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانے سے دریغ نہیں کرتا۔ اسی نکتے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سجاد حارث لکھتے ہیں:

"نوآبادیاتی نظام میں استعماری حکمران یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ سیاسی احتساب اور دارورسن کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس ضمن میں ان کی کوتاہی رعایت

اور غفلت شعاری سے حریتِ فکر، روشن خیالی، بغاوت اور انقلاب کا لاوا جمع ہو کر ان کے لیے نامساعد حالات اور مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ یہ حکمتِ عملی حکمران طے کرتے ہیں کہ کس شہر پر، ادیب اور دانشور پر کس دفعہ کے تحت، احتسابی اور قانونی کاروائی عمل میں لائی جائے۔ وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ سیاسی بغاوت کو اخلاقی بغاوت، غداری اور تخریب کاری کا نام دے کر کس طرح قانون کا پھندا ڈالا جاسکتا ہے۔^{۱۱} (۲۹)

i. پہلے مارشل لا کے خلاف مزاحمت

مدبروں نے وفا کے چراغ گل کر کے
دراز دستی جاہِ حشم کو عام کیا
(نظمِ پیہر، شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۳۰۲)

قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بعد آئینِ معطل کر کے مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ اُس وقت اس بات کا علم ہوا کہ چند مخصوص ذہنیت کے حامل افراد نیت میں فتورِ دلوں میں کھوٹ لے کر کمین گاہوں میں بیٹھے ہوئے اقتدار و دولت کے بھوکے ہیں۔ ان تمام حالات کو دیکھ کر فرار کو سخت تکلیف ہوئی تو انھوں نے ایک نظم لکھی "تیرے بعد" اس میں باغبان سے گلستان کی صورتِ حال کو بیان کیا گیا ہے کہ اب تیرے گلستان کے شاخِ گل پر الوؤں کا بسیرا ہے۔ دن بدن بڑھتی ہو س کی بدولت دولت و حکومت کی خواہش رکھنے والے درندہ صفت افراد ملک کو لوٹ رہے ہیں۔

انہوں نے اس نظم کو تحریر کر کے بلوں میں چھپے ہوئے زہریلے سانپوں کے ڈسنے کے طرز اور ان کی سیاہ کاریوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ یہ نظم کلیت پر مشتمل نظم ہے۔ ہر دور کو اس ضمن میں لیا جاسکتا ہے۔ وہ اس نظم میں اس دُکھ درد کو شکایتی لہجے میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے بانیِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح بر صغیر کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم دیکھ کر آپ سے رہانہ گیا۔ ان کی دادرسی کرتے ہوئے آپ نے ایک نظریاتی ریاست قائم کر کے مسلمانوں کو دے دی تھی، لیکن آپ کی رحلت کے بعد اس عظیم گلستان میں پھر سے نشیب و فراز کا عالم ہے۔ یہاں پھر سے سکھ کا سانس لینے اور اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے آواز بلند کی جا رہی ہے لیکن فریاد سننے والا کوئی نہیں ہے۔

اس نظم میں انہوں نے قیام پاکستان کے لیے قربانی دینے والوں کے ساتھ کیے جانے والے ظلم و زیادتی کو بیان کرتے ہوئے آمروں کی راہ ہموار کرنے والوں کی ذہنیت سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ آمریت کی بنیاد رکھنے والوں نے بانی پاکستان کی ہمراہی میں قربانی دینے والے سرفروشنوں کے جذبات کو نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ ان کو ہراساں کرنے لگے۔

قیام پاکستان کے بعد مسلمان ظلم و ستم سہتے ہوئے خون کے دریاعبور کر کے اس مقدس سرزمین پر قدم رکھ کر مسرور تھے کہ ان کو یہاں سکون کے ساتھ سانس لینے میں کوئی دقت و دشواری نہیں ہوگی۔ ہر طرف آزادی کی بہار ہوگی، لیکن جذبہ ایمانی سے سرشار ان سرفروشنوں کو کیا خبر تھی کہ محسن پاکستان کے بعد چند بدخواہوں کے قہر و عذاب کے سائے میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں گے اور آزادی کی مخالف قوتوں یعنی ہندوؤں اور انگریزوں کے خلاف لگانے والے نعروں کی حرمت باقی نہیں رہے گی۔ اپنی جائیداد مال و متاع اور سب کچھ قربان کر کے آنے والے سرفروشنوں کو ہر گز اس بات کا علم نہیں تھا کہ انگریزوں اور ہندوؤں کے ظلم و بربریت اور ان کی تہذیب و تمدن سے اختلاف کے باعث ہر قربانی دے کر آزادی کامل کے خواب لے کر پاکستان کی طرف منتقل ہونے والے پھر سے اپنے لوگوں کے ظلم کی چکی میں پسے جائیں گے۔ ان تمام تلخ حقائق کو وہ اپنے ان اشعار میں بیان کرتے ہیں۔

آندھیاں خاک اڑاتی ہیں کہ صحن چمن
لالہ و گل ہوئے شاخوں سے جدا تیرے بعد
جاہ و منصب کے طلب گاروں کے یوں ہاتھ بڑھے
کوئی دامن بھی سلامت نہ رہا تیرے بعد
جن کو اندازِ جنون تو نے سکھائے تھے کبھی
وہی دیوانے ہیں زنجیر بہ پا تیرے بعد
(تیرے بعد، شب خون، ص ۷۸)

ہر طرح کی آزادی کی خواہش کے ساتھ دنوں کا سفر ہفتوں میں طے کر کے پاکستان آنے والوں کے ساتھ روا کیے جانے والے ناروا سلوک اور ان کے جذبات مجروح ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منیر احمد یوں تحریر کرتے ہیں:

۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء کو جب لاکھوں مسلمانوں کی قربانی کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تب کسی نے یہ سوچا بھی نہ تھا یہ ملک بعض جرنیلوں کے جبر کا نشانہ بنے گا اور یہاں پر حکومتیں عوام کی مرضی کی بجائے جرنیلوں کی منشا اور رضا سے بنا اور ٹوٹا کریں گے۔" (۳۰)

تمیز رہبر و رہزن ابھی نہیں ممکن

ذرا ٹھہر کہ بلا کا غبار راہ میں ہے

(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۴۸۳)

احمد فراز ایوب خان کے مارشل لا کے اثرات دیکھ رہے تھے اور اُس وقت کی صورتِ حال سے مطمئن نہیں تھے۔ ملک کی بھاگ دوڑ سنبھالنے والوں کو ملک اور غریب عوام کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ہر کوئی منصب و دولت اور ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے دیوانہ وار غلط راستہ چن رہا تھا۔ فراز نے اُس وقت صرف آمرانہ کے ہمنواؤں کی مخالفت نہیں کی بلکہ عوام کی بے شعوری پر بھی تنقید کی ہے۔ انھوں نے اس شعر کے ضمن میں بہت سے نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلا یہ کہ قائد کے حیات میں ہی کچھ لوگ درپردہ مخالف نظریہ رکھتے ہوئے آرہے تھے۔ ان کو قائد اعظم کھوٹے سکے کہا کرتے تھے۔ لیکن قائد اعظم کی رحلت کے بعد ان لوگوں کی بدینتی لوگوں کے سامنے آشکار ہو چکی تھیں۔ احمد فراز نے لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ ملک کے خیر خواہوں اور بدخواہوں پر نظر رکھتے ہوئے ملک کو بچانے کی کوشش کریں۔ انہوں نے یہ سمجھانے پر زور دیا کہ دُزدان صفت لوگ مملکت کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس وقت ایوب خان یہ شوشہ اور غلط افواہیں اور بے بنیاد باتیں پھیلا کر عوام کو گمراہ کر رہا تھا کہ ملک کی بقا اس کی حکومت کی بقا پر منحصر ہے اگر یہ حکومت ختم ہو جائے تو دشمن اس ملک پر قبضہ کر سکتا ہے۔ وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر یہ خبریں اس وجہ سے زبان زد عام کر رہا تھا کہ اس کے مقابلے میں کوئی شخص نہ آسکے۔

ایوب خان کے سیاہ کارناموں میں ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ ان کے مقابلے میں آنے والی شخصیات پر ملک دشمنی اور ملکی سلامتی کے لیے خطرہ جیسے الزامات لگائے جا رہے تھے۔ اسے مادرِ ملت فاطمہ جناح کی ہستی کو سیاسی فتح حاصل ہونے کا بہت ڈر اور خوف تھا۔ شاعری کے ذریعے فراز نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ ایوب خان آئین و قانون کو پامال کرتے ہوئے مزید حکمرانی کے لیے عوام کو فریب دے رہا تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے

میں مادرِ ملت تھیں جو بانی پاکستان کی ہمراہی میں جدوجہد کرتی رہی تھیں اور بعد میں بھی عوام اور جمہوریت کے لیے اس وقت کی آمریت کو لٹکا رہی تھیں لیکن یہ افسوس کا مقام تھا کہ عوام رہبر و ہزن میں فرق و تمیز کرنے میں ناکام رہی۔ حمیرا طہر نے اس تاریخی حقیقت کے بارے میں یوں لکھتی ہیں:

"محترمہ کا کہنا تھا کہ ہم پاکستان کے مستقبل کا انحصار کسی ایک شخص کی زندگی پر نہیں کر سکتے، کیونکہ کوئی بھی شخص قیامت تک نہیں رہتا۔ ہم ایسا نظام کیوں نہ اپنائیں جس میں کسی ایک کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑے اور ملک جمہوریت کی راہ ہر گامزن رہے۔ قائدِ اعظم اور دنیا میں نہیں رہے لیکن پاکستان موجود ہے اور ان شاء اللہ قائم دائم ہوگا۔" (۳۱)

غریب شہر کسی سایہ شجر میں نہ بیٹھ
کہ اپنی چھاؤں سے خود جل رہے ہیں سرو سمن
(درد آشوب، ص ۳۵)

حکمران مادرِ ملت کے صدارتی انتخابات میں آنے کے بعد ان کی عوامی قوت سے بہت خائف تھے۔ مادرِ ملت نے پامردی کے ساتھ اربابِ اقتدار یعنی ایوب خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کا عزم لے کر میدان میں قدم رکھا تھا۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شریف فاروقی لکھتے ہیں:

"محترمہ فاطمہ جناح نے صدر ایوب کی "زیادتیوں" کو جس واشگاف انداز میں بے نقاب کیا ہے اور جس جوش و جذبہ کے ساتھ ان کی مذمت کی ہے اس سے اربابِ اقتدار بوکھلا اٹھے ہیں۔ ایک طرف طلبا محترم فاطمہ جناح کے پرچم تلے ہو گئے ہیں تو دوسری جانب وکیل ان کے حمایت کر رہیں۔۔۔۔۔ اخبارات کے مدیروں نے بھی حکومت کے متشددانہ پریس خواتین کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" (۳۲)

ظالم و جابر ہر وقت سچ اور حق سے خوف کھا رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنی مخالف طاقتوں کو منصب کا لالچ دے کر یا ڈر ادھمکا کر خاموش کرتا ہے۔ یہ طریقہ اس دور کے آمر نے بھی اپنایا جیسے روزنامہ، نوائے وقت راولپنڈی، ۲ نومبر ۱۹۷۰ء، میں یہ خبر چھپ چکی ہے۔

"۔۔۔۔۔ جناب حفیظ ہی کیا دنیا جانتی ہے کہ ایوب خان محترمہ مادرِ ملت کے بعد پنجاب میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی ذاتی وجاہتوں سے خائف تھا۔ چنانچہ دورِ آمریت کے بڑے

بڑے عقیدہ گویوب خان کے کہنے پر اس کوشش میں رہے کہ جاوید اقبال کو عہدوں اور وزارتوں کا لالچ دے کر قومی احساسات سے الگ کر دیا جائے" (۳۳)

اول تو آمر اپنی کرسی بچانے کے لیے اپنے علاوہ دوسروں کو بھی بے ضمیر اور ضمیر فروش بنانے میں مصروف رہا۔ دوم ایوب نے دھمکیوں کا سلسلہ بھی شروع کیا تاکہ کوئی بھی مخالفت کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اس کا واضح ثبوت ایوب خان کے بیٹوں کا کراچی میں کھلے عام فائرنگ کرنا ہے۔ اس حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے عالم عباس لکھتے ہیں:

"جب جنوری ۱۹۶۵ء میں ایوب خان کے بیٹوں نے کراچی میں جشن فتح کے جلوس میں مہاجر عوام پر گولیاں چلائیں کیونکہ انہوں نے صدارتی انتخابات میں مادرِ ملت فاطمہ جناح کو ووٹ دیے تھے۔" (۳۴)

بانی پاکستان ہوں یا مادرِ ملت یا کوئی اور مخلص قیادت ان کو اپنے ملک میں ان کی قربانیوں اور کوششوں کا صلہ نہیں ملا۔ اس کی اصل وجہ آمریت کی انا اور خیانت کاروں کی بدخواہی ہے۔ یہ بدخواہ لوگ منافقت کے لبادہ اوڑھ کر ہمیشہ دُورِ خی کے ساتھ زندگی کے سفر میں رہتے ہیں۔ اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے احمد فراز نے لکھا ہے:

جیتے جی تو نہ پائی چمن کی مہک
موت کے بعد پھولوں کے مرقد ملے
(فنکاروں کے نام، شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۱۹۳)

گزرا ہوں جس طرف سے بھی پتھر لگے مجھے
ایسے بھی کیا تھے لعل و جواہر لگے مجھے
(نایافت، ص ۵۳)

ایوب خان اور ان کے رفیق کار اپنی کامیابی پر جشن منا رہے تھے۔ لوگ بھی اس میں شامل تھے لیکن فراز نے جشن منانے والوں اور ان کے درباری شعرا جو ستائشی اشعار کو نہایت عمدگی کے ساتھ سنارہے تھے کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے ان کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ہر طرف استحصال کی آندھیاں چل رہی ہیں اس کے باوجود جشن اور رقص و سرود کی محفل جمانا مناسب نہیں۔ انہوں نے اس شعر کے ذریعے اقتدار

پر قبضہ کرنے اور ان کی حمایت میں تقریر کرنے والوں سے اختلاف کیا ہے۔ خصوصاً آمر کی تعریف اور گن گانے والے شعرا کے جملوں کو پتھر کی بارش سے تشبیہ دی ہے۔ انہوں نے یہ پیغام دیا ہے جو عمومی اور کلی ہے۔ جمہوری مملکت و حکومت ہماری آخری منزل ہے۔ ملک میں جمہوری نظام کی خواہش رکھنے والے سیاست دانوں، سماجی کارکنوں اور اہل دانش و قلم اور عوام کو احتیاط سے قدم اٹھانے کی تاکید کی ہے۔

iv. دوسرے مارشل لا کے خلاف مزاحمت

ہوتا رہا ہے فضا کا اٹوٹ ستارا

افق سے پھر کوئی آندھی اُترنے والی ہے

(تہاتہا، ص ۴۴)

ایوب خان کے دور میں جب اس کی شدید مخالفت ہونے لگی خاص کر معاہدہ تاشقند کی وجہ سے تو ان کے خلاف باقاعدہ تحریک چلی۔ اس تحریک میں سیاست دانوں نے کافی اہم کردار ادا کیا۔ آخر کار وہ استعفیٰ دینے پر مجبور ہو گیا۔ ان کے دور میں معاشی پالیسی میں کچھ بہتری آئی تھی لیکن وہ یہ تسلسل قائم نہ رکھ سکا۔ کیونکہ امیر طبقے اس کے مخالف تھے اس صورت حال کو بھانپ کر ایوب حکومت کے قدموں میں لغزش آگئی۔

اپنی شاعری کے ذریعے وہ دوسرے مارشل لا کے دوران بھی مارشل لائی حکومت کی مخالفت کرتے رہے۔ اس وقت کے حالات، حرکات و سکنات اور واقعات پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس لیے لوگوں کو بتایا کہ اپنی تحریک کی کامیابی پر زیادہ خوش نہ ہوں کیونکہ اس ملک پر آندھی چلنے کی جو رسم چلی ہے وہ دوبارہ چلنے والی ہے۔ ان کو علم تھا کہ یحییٰ خان اقتدار کے لیے خفیہ طور پر دیوانہ وار پھر رہے تھے۔ یحییٰ خان کو دو وجوہات کی بنا پر اس اقتدار غیر آئینی پر قبضہ کرنے میں آسانی ہوئی۔ پہلی یہ کہ اُس وقت لوگ ایوب کے خلاف نکل رہے تھے ساتھ میں معاہدہ تاشقند نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دوسری وجہ یہ کہ انہی ہنگاموں کے دوران جب ایوب خان ناسازی طبیعت کی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ تو یحییٰ خان کو ان کی تمام فائل کو پڑھنے کا موقع ملا اور تمام حالات و سازش سے باخبر ہوئے اور کسی کی بھی ایوب خان سے ملاقات پر پابندی لگا دی گئی۔

فراز کو اس بات کا اندازہ تھا کہ پاکستانی نظام سیاست میں حصول اقتدار کی خواہش لے کر سیاست دان ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچ کر اقتدار کی کرسی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کی روایات فوج میں بھی کچھ حد تک پائی جاتی ہیں۔ جس طرح سیاست دان دوسرے گروہ، دوسری جماعت کی حکومت کو

غیر فعال کر کے ختم کرنے کے لیے مختلف سازشوں کا سہارا لیتے ہیں اسی طرح فوج کی تاریخ میں بھی یہ وطیرہ رہا ہے۔ منیر احمد اسی موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اتنا ہم جس طرح سیاست دانوں کو ایک دوسرے کا اقتدار میں رہنا اچھا نہیں لگتا اسی طرح فوجی حکومت بھی پھولوں کا سچ نہیں ہوتی بلکہ نچلی سطح سے Top Level تک کوئی نہ کوئی آمر مطلق کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہی ہے۔ ایوب خان نے اسنکدر مرزا کے خلاف کامیاب سازش کی جبکہ یحییٰ خان نے ایک موقع پر سیاست دانوں کے ذریعے حالات اتنے خراب کروا دیے کہ ایوب خان کو اقتدار سے الگ ہونا پڑا۔" (۳۵)

انہوں نے اپنے اشعار میں آمریت کے اقتدار پر قابض ہونے کے لیے بے تاب ہونے اور حالات سازگار کرنے جیسے حقائق کے تمام پس منظر کو بیان کر دیا ہے۔ جب ملک میں سیاسی بحران کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس وقت ایوب خان کی حمایت نہ سہی، فوج اس بحران کو ختم کر کے حالات پر امن بنا سکتی تھی۔ لیکن یحییٰ خان بھی اقتدار کے لیے بے تاب تھا۔ اسے ملک میں ہونے والے خلفشار سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ حصول اقتدار کے لیے دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا۔ مسعود الحسن اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسمہ دسمبر کو سیاسی سرگرمیوں پر پابندی اٹھنے کے بعد سیاست دانوں نے فیلڈ مارشل ایوب خان کو زچ کرنا شروع کر دیا جبکہ آرمی چیف آغا محمد یحییٰ خان اس دوران ہونے والے ہنگاموں اور حکومت کی بے بسی پر محفوظ ہوتے رہے۔ وہ بڑی بے تابی سے اس وقت کا انتظار کر رہے تھے کہ حکومت اس قدر بے بس ہو جائے کہ آخری چارہ کار کے طور پر انہیں تھالی میں سجا کر پیش کر دے۔" (۳۶)

ایوب خان نے استعفیٰ کا اعلان تو کر دیا لیکن درپردہ ان کے اعلان سے پہلے ہی یحییٰ خان نے اپنی گرفت مضبوط کر کے تمام مراحل اور انتظامات مکمل کر لیے تھے۔

آئین خرابات معطل ہے تو کچھ روز
اے رندِ بلا نوش و تہی جام ترس بھی
صیاد و نگہبانِ چمن پر ہے یہ روشن
آباد ہمیں سے ہے نشیمن بھی قفس بھی
(شہر سخن آراستہ، ص ۲۷۰)

احمد فراز نے یحییٰ خان کے اقتدار پر قبضہ کرنے کو آئین شکنی سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے نے ارباب اقتدار پر طنز کرنے کے ساتھ ساتھ ایوب خان پر بھی تنقید کی ہے کہ اگر ملکی حالات اور ایوب کے خلاف چلنے والی تحریک کی وجہ سے وہ مستعفی ہونے پر مجبور ہو گئے تھے تو ان پر لازم تھا اقتدار کو آئین کے حوالے کریں۔ لیکن انہوں نے جس طرح آتے ہوئے قانون کی پاسداری نہیں کی تھی اسی طرح جاتے جاتے آئین کو ایک دفعہ پھر پاؤں تلے روندتے ہوئے زمام حکومت کو آمریت کے حوالے کر دیا قانون یہ تھا کہ جب حکمران مستعفی ہونے پر مجبور ہو جائے تو تمام آئینی اختیارات کو سپیکر کے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن وہ اس راہ سے منحرف ہوتے ہوئے آمر کے ہاتھ مضبوط کر کے چلے گئے۔ ان کے آئین سے منحرف ہونے ذکر مسعود الحسن اس طرح کرتے ہیں: ”چنانچہ انھوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو صدارت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اختیارات آئین کی رو سے اسپیکر کو سپرد کرنے کے بجائے کمانڈر انچیف آغا محمد یحییٰ کے حوالہ کیے۔“ (۳۷)

احمد فراز نے حاکم کو اس کی حکومت کی بے ثباتی اور عوام کو اس غیر آئینی فضا اور جبر کے بادل کے جلد چھٹ جانے کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آئین اگر معطل ہوا بھی ہے تو اس کی مدت مختصر ہوگی اور بہت جلد آئین شکن اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے گا۔ وہ اس بات پر نازاں تھے کہ ملک میں آئین کی بالادستی کے خواہاں احساس ملی و قومی کو قلم اور نغموں کے ذریعے قوت بخشنے والے اہل قلم حضرات ہیں۔ اگر یہاں آئین و قانون کی بالادستی کے حق میں آواز اٹھتی ہے تو وہ نوا گر بھی چند قلم کار اور باضمیر لوگ ہیں۔ ان ہی لوگوں سے وطن آباد ہے۔ یہ نوا گردرون قفس میں بھی آشیانے کی خاکستری پر نوحہ گری کرتے ہیں۔

کبھی یہ شہر مرا تھا زمیں میری تھی
مرے ہی لوگ میرے ہی دست و بازو تھے

خبر نہیں یہ رقابت تھی ناخداؤں کی
کہ یہ سیاستِ دربان کی چال تھی کوئی
دو نیم ٹوٹ کے ایسی ہوئی زمین جیسے
مری اکائی بھی خواب و خیال تھی کوئی
(بگلہ دیش، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۳۵۸)

سقوط ڈھاکہ کا واقعہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے اُردو ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ اُردو ادب میں سقوط ڈھاکہ پر کافی بحث موجود ہے۔ اُردو نثر اور شاعری دونوں اصناف میں سقوط ڈھاکہ پر کافی بحث ہوتی رہی ہے۔ سقوط ڈھاکہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کی بنیاد دشمنانِ پاکستان نے بہت عرصہ قبل رکھی تھی۔ پاکستان کے دشمنوں نے ہی پاکستان کو دو نیم کرنے کی سازش اور منظم منصوبہ بنایا تھا۔ پاکستان دو لخت ہونے کا یہ المناک سانحہ ایک ایسا غیر معمولی سانحہ تھا۔ جس کی وجہ سے پاکستان کو بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس سانحے کا اثر ہر محبِ وطن پاکستانی بالخصوص محبِ وطن شاعر اور ادیب پر زیادہ پڑا۔ شعر اور ادیبوں نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے کیا۔ مشرقی پاکستان کا الگ اور جدا ہونا تناظرِ خطرناک سانحہ تھا کہ بعض حساس اور دردملت و وطن سے سرشار شاعر اس غم و تکلیف کے باعث دنیا سے چل بسے۔ خصوصاً ناصر کاظمی کے حوالے سے یہ بات مشہور ہے۔ پاکستان کو دو نیم کر کے مشرقی پاکستان کو مبدل بہ بنگلہ دیش کر کے عالمی نقشے پر الگ ملک کی حیثیت سے نمایاں کرنے میں بین الاقوامی سازش و سیاست کے ساتھ آمریت کی خواہش اقتدار و مسند نشینی، سیاست دانوں کی اقتدار کی لالچ اور ازلی دشمن بھارت کی خفیہ طاقت کا استعمال یہ سب حربے اور عناصر کار فرما تھے۔ سقوط ڈھاکہ ایسا واقعہ ہے کہ اس حادثے کے عوامل و حقائق کیا تھے کافی بحث و تحقیق کے بعد بھی کبھی سامنے نہیں آئے۔

احمد فراز جیسا حساس شاعر اس واقعے اور سانحے سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکا۔ انھوں نے بھی اپنی نظموں میں اس سانحے کے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ملک کے تقسیم ہونے پر ہونے والے دکھ درد کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سازشی عناصر کے رویے کی بھرپور مخالفت کرتے ہوئے اس مسئلے کو سلجھانے کے بجائے الجھانے والوں پر تنقید کی ہے۔ اس واقعہ میں ملوث افراد اور سازش کاروں کو بے نقاب کرنے اور اس سانحے میں کردار ادا کرنے والے غیر ملکی گروہ کے ساتھ ملکی سطح کی ہماری سیاسی اور عسکری طاقتوں کو بھی ہدفِ تنقید بنادیا ہے۔

اس گھناؤنی سازش میں امریکہ نہ صرف شریک کار رہا بلکہ اس نے تمام اخلاقی، انسانی اور سفارتی اصولوں کو پاؤں تلے روند کر منظم پالیسی بنائی۔ اس کے علاوہ ملک کے سیاست دانوں کو بھی خریدنے اور ان کو دباؤ میں لا کر اپنی خواہش کی تکمیل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ امریکہ کی اس عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وسیم گوہر نے یہ بات تحریر کی ہے ”پاکستان کے گورنر جنرل اور وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے بھی بعد میں

ایک اخباری بیان کے ذریعے انکشاف کیا کہ امریکن سفیر نے ان سے رابطہ کر کے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لیے کام کرنے کو کہا تھا۔“ (۳۸)

ملک کی آمریت مسئلہ بنگال کو کس نظر، نوعیت اور حساسیت کو کس طرح سے دیکھتی اور اس اہم قومی مسئلہ کو کتنی اہمیت دیتی تھی۔ اس بات کا اندازہ ہمیں گوہر ایوب کی اس تحریر سے ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

”۔۔۔ اور نومبر کے آخر میں جب مشرقی بازو کے دہکتے الاؤ ملک کو جلا کر خاکستر کر رہے تھے تو ایک سینئر بیورو کریٹ یحییٰ کے پاس گیا اور کہا: سر! یوں لگتا ہے کہ مشرقی پاکستان پھیلتا جا رہا ہے، ہمیں کچھ نہ کچھ اب ضرور کرنا چاہیے۔ جس پر یحییٰ خان نے کہا۔۔۔ اسے بھول جاؤ یہ اتنا قیمتی نہیں کہ ہم کالے بنگالیوں سے لڑتے پھریں۔“ (۳۹)

جنرل یحییٰ خان نے اس کو یعنی مسئلہ بنگال کے حالات کو سنجیدگی سے حل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی منشا و خواہش اور عسکری ذہن سے اسے حل یا خاموش کرنا چاہتے تھے۔ اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گوہر و سیم لکھتے ہیں:

”پاکستان اپنی تاریخ کے سنگین ترین بحران سے گزر رہا تھا اور اس نامساعد حالات سے نکالنے کے لیے باصلاحیت سیاسی قیادت کی اشد ضرورت تھی۔ ایک غیر ملکی جریدے کے مطابق یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے بحران اور جنگ سے پیدا ہونے والی صورت حال کو خالص سٹاف کالج کے انداز میں حل کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ پاکستان کی تباہی کی شکل میں برآمد ہوا۔“ (۴۰)

قیام پاکستان اور تحریک پاکستان میں بنگالیوں کی قربانیوں اور جدوجہد سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن قیام پاکستان کے بعد حکمرانوں کی طرز حکومت اور سیاست دانوں کی نیت و عمل سے دن بدن وہ لوگ مایوس ہوتے گئے۔ ان کا نظریہ تھا کہ آمریت اور جمہوریت کے ظاہری نعرہ لگانے والوں کے غیر آئینی کارناموں نے ان کو الگ قوم ہونے کے احساسات اور جذبات کی طرف دھکیل دیا گیا ہے۔ احمد سلیم ان کی قربانی اور مایوسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قیام پاکستان کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنگالیوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ انہیں اپنے مفادات ترقی اور مستقبل خطرہ میں محسوس ہونے لگا۔ اسی عزم تحفظ کے

احساس سے "بنگالی قومیت" نے فروغ پانا شروع ہوا۔ یاد رہے کہ یہ وہی بنگالی تھے جنہوں نے پاکستان کے لیے ووٹ دیے تھے۔" (۴۱)

اب کس کا جشن مناتے ہو
اُس دیس کا جو تقسیم ہوا
اب کس کا گیت سناتے ہو
اس تن من کا جو دو نیم ہوا
اس پرچم کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہوئی
اس مٹی کا جس کی حرمت
منسوب عدو کے نام ہوئی
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۴۸۹)

وہ اپنی اس نظم کی وساطت سے حکمرانوں کے رویے سے سخت اختلاف کرتے ہوئے جشن و غم منانے کے زمانے اور طریقے کو بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جشن جنگ ہارنے پر نہیں جیتنے پر منایا جاتا ہے۔ اب تو ہم یہ جنگ ہار چکے ہیں ابھی زخم مندمل نہیں ہوئے۔ قلب و جگر کا درد باقی ہے یہ کیسا جشن کا موقع و محل ہے؟ ان مناظر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کیسے انسان کا خون بہایا گیا اور پھول مسلے گئے۔ انہوں نے اشعار کی وساطت سے منافقت اور دوغلی پالیسی سے پردہ ہٹایا ہے اور اس بات پر طنز کیا ہے کہ اس سانحہ کی فضا سازگار کرنے والوں نے آج بہت جلد جشن کا اہتمام کیا ہے۔

وہ اپنے ملک کے حکمرانوں کی غلط پالیسی اختیار کر کے عوام پر ظلم کرنے اور قومی پرچم کے سرنگوں ہونے پر درد و تکلیف سے چیخ اٹھتے ہیں۔ انہوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہر ملک کا الگ تشخص اور الگ پہچان ہوا کرتی ہے اور اس عظیم نظریاتی ملک کی شناخت و پہچان سبز ہلالی پرچم ہے۔ یہ اس مملکت کے ماتھے کا جھومر ہے۔ ہر ملک کے باشندوں میں حب الوطنی کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ وہ ملک کے دفاع کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ اپنی ملک کی شناخت پر آنچ آنے نہیں دیتے۔ اگر کوئی دشمن اس سر بلند پرچم کو سرنگوں کرنے کی خواہش کرتا ہے تو ان بدخواہوں سے مقابلے اور اس پرچم کی حفاظت و سر بلندی کے لیے مہمان وطن اپنی جان

نثار کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ کسی بھی ملک کا جھنڈا سازش و طاقت کے تحت اُتارا جائے تو یہ اُس ملک کی سلامتی و شناخت کی توہین شمار ہوگی۔

بنگلہ میں ۲۳ مارچ کو سبز ہلالی پرچم کی جگہ کوئی اور جھنڈا آویزاں کیا گیا اور ہمارے پرچم کی بے حرمتی کی گئی۔

اس تلخ حقیقت میں نشہ اقتدار میں مست حاکموں اور ان کے ہم راہی میں رہنے والے سیاسی لوگ کا کردار رہا ہے۔ وسیم گوہر بنگال میں ہونے والی صورتِ حال کو یوں بیان کرتے ہیں:

"۲۳ مارچ کو مجیب الرحمن کی رہائش گاہ پر بنگلہ دیش کا پرچم ہرایا گیا۔ پورے شہر میں کہیں بھی پاکستان کا پرچم نہیں لہرایا گیا بلکہ گلیوں میں اسے پیروں تلے روند کر اس کی بے حرمتی کی گئی۔" (۴۲)

بے برون در کوئی روشنی نہ سایہ تھا
سبھی فساد مجھے اندرونِ خانہ لگا
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۵۱۲)

احمد فراز نے سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے بیرونی اور اذلی دشمنوں کی سازش سے بڑھ کر آمروں اور سیاست دانوں کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ملک کے دولخت ہونے کے حقائق کو کریڈتے ہوئے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ یہ سانحہ آمروں اور سیاست دانوں کے اقتدار کی ہوس اور ان کی خیانت کاری کی وجہ سے پیش آیا ہے۔ سہیل وڑائچ لکھتے ہیں:

"سوال: ۱۹۷۱ء کو جو المیہ ہے یہ صرف یحییٰ خان کی ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے ہوا یا پوری فوج اس کی ذمہ دار ہے؟ جزایم۔ اظہر: میں فوج کو نہیں سیاست دانوں کو بھی ذمہ دار سمجھتا ہوں۔" (۴۳)

بنگلہ کے باشندے آزادی فکری آزادی کے ساتھ معاشی آزادی و ترقی پر کامل و راسخ یقین رکھتے تھے۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ بنگالیوں کی اسی سوچ اور حقیقت کے بارے میں ملک عزیز پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی نے کہا تھا:

"فروری ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے کہا تھا مشرقی بعید کا علاقہ صدیوں سے فاقوں و باؤں کا شکار رہا ہے۔ اس کے لاکھوں باشندوں نے انسانیت

سے گری ہوئی زندگی گزاری ہے۔۔۔ گویا قدرتی طور پر ان کے ذہنوں میں آزادی کا مفہوم و معاشی آزادی میں نقش ہو گیا۔ لہذا آج یہ لوگ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جب ان کو آزادی حاصل ہو گئی ہے، تو ان کو افلاس اور امراض سے بھی چھٹکارہ ملنا چاہیے۔ ہمیں اس بے صبری کے لیے ان کو مورد الزام نہیں ٹھہرانا چاہیے۔" (۴۴)

پاکستان کی آمریت، سیاست دانوں کی خواہش اقتدار و عدو کی سازش و ضد اور بین الاقوامی مکروہ پالیسی کی وجہ سے بنگال کے باشندوں کے سیاسی و سماجی حقوق سلب ہوتے رہے اور بالآخر وہ لوگ الگ تشخص کے لیے سوچنے لگے اور ۱۹۷۱ء کے آخری ماہ میں ملک دو نیم ہوا اور بنگلہ دیش قائم ہو گیا۔

ملک دو نیم ہونے اور اس تاریخی قتل و غارت گری میں کس کا کردار اور کس کا ہاتھ تھا۔ یہ دقت طلب اور بحث طلب مسئلہ رہا ہے۔ اس موضوع پر بہت بحث ہوتی چلی آرہی ہے۔ بعض سیاسی گروپ کسی دوسری سیاسی جماعت کو اس واقعے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو بعض اس کا الزام آمروں پر لگا دیتے ہیں۔

ملک کے دو نیم ہونے میں کلی طور پر آمریت کو مورد الزام ٹھہرانا بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ اس پُر درد واقعہ میں سیاسی سطح پر بھی کوتاہیاں اور غلطیاں ہو گئی تھیں۔ سیاست دانوں کی ہوس، ضد، عدم ہمدردی اور عدم صبر و استقامت بھی ملک دو نیم ہونے کی وجہ بنی۔ مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کے غیر مخلص کردار و عمل کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں اور عوام میں الگ قوم ہونے کے نظریے نے جڑیں مضبوط کر لیں۔ اُس وقت جب قومی اسمبلی کے اجلاس کے لیے تاریخ مقرر ہو گئی تو ذوالفقار علی نے ایک بہت بڑا اعلان کر دی۔ اس اعلان کے ضمن میں بنگال کی واضح اکثریت کو نظر انداز کرنے کی کیفیت و حقیقت عیاں تھی۔ اس اجلاس کی مخالفت کرنے پر شیخ مجیب نے اپنی واضح اکثریت کی قوت دکھانے اور احساس دلانے کی کوشش کی اور اپنی آنا پر باقی رہنے کا عندیہ بھی دیا۔ اسی حقیقت کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے گوہر ایوب لکھتے ہیں:

"بھٹو نے یہ اعلان بھی کیا کہ جو کوئی قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کرنے ڈھاکہ جائے گا وہ اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ جنرل یحییٰ خان بھٹو کے دباؤ میں آ گئے۔ ۲۸ فروری ۱۹۷۱ء کو جنرل یحییٰ خان نے ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا افتتاحی اجلاس بلانے کی تاریخ منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ بھٹو کی طرف سے ادھر ہم ادھر تم کے نعرے نے عوامی لیگ کے ساتھ سیاسی اور فوجی تنازعے کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔" (۴۵)

شیخ مجیب الرحمان بھی بنگالیوں کے جذبات اُبھارنے میں مصروف تھے۔ وہ مغربی پاکستان پر تنقید کر کے اپنی بات منوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بنگالی باشندوں کے جذباتی ہونے میں چند عوامل کار فرما تھے۔ پہلی بات یہ تھی کہ قیام پاکستان کے بعد انہیں کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ دوسری بات جب اُردو کو قومی زبان قرار دیا گیا تو مشرقی پاکستان میں بھی بنگال والوں کی طرف سے مخالفت سامنے آگئی۔ تیسری بات خواجہ ناظم الدین کی حکومت جب برخاست کر دی گئی تو اس سے یہ تاثر پھیل گیا تھا کہ مغربی پاکستان کا رویہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے کچھ مثبت نہیں ہے۔ چوتھی اور آخری بات یہ تھی کہ انتخابات میں اکثریت کے باوجود اس حقیقت اور قوت کو نظر انداز کرنے کے اعلانات کیے گئے۔

پھر یوں ہوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے

احمد فراز مشرقی پاکستان کے متعلق لکھی جانے والی نظموں میں نوحہ گر نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں تکلیف دہ امر یہ ہے کہ پاکستان کا بازو جدا ہو گیا۔ صدیوں کا شریک سفر منزل پر پہنچتے ہی پھٹ گیا۔

v. تیسرے مارشل لاء کے خلاف مزاحمت

وفا کے بھیس میں کوئی رقیبِ شہر بھی ہے
حضر کہ شہر کا قاتلِ طیبِ شہر بھی ہے
وہی سپاہِ ستمِ خیمہ زن ہے چاروں طرف
جو میرے بخت میں تھا اب نصیبِ شہر بھی ہے
(شہر سخن آراستہ، ص ۹۰۰)

احمد فراز کی مزاحمتی شاعری میں اس وقت شدت آگئی جب ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالتے ہی وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ظلم و ستم کرنا شروع کر دیا۔ ان کے دورِ آمریت میں ہر طرف پابندیاں ہی پابندیاں تھیں۔ اس مارشل لاء میں شعراء اہل قلم و دانش کے علاوہ جمہوریت پسند عوام کے بھی ہلنے اور حرکت کرنے تک ہر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ ضیاء الحق کا یہ مارشل لاء ملکی تاریخ کا سب سے بدترین دور تھا۔ احمد فراز ابتدا سے لے کر آخر تک اس کی مخالفت کرتے رہے۔

یہ دورِ آمریت تاریکی اور جہالت کا دور تھا۔ اس دور میں ملک ترقی کی راہ سے کٹ کر زوال کی طرف چلا گیا۔ یہ زوال پذیری صرف فکری اور تہذیبی ہی نہیں بلکہ یہ زوال مذہبی، لسانی اور سیاسی سطح کا زوال تھا۔ اس وقت ضیاء الحق نے ملک کی بنیادوں میں جو زہر اور مذہبی انتہا پسندی جیسی چیزیں ڈالی تھیں اس کا خمیازہ آج بھی ملک و قوم بھگت رہی ہیں۔

ملک میں قومی اتحاد نے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف احتجاج کیا تو موقع غنیمت سمجھتے ہوئے اس نے غیر آئینی اقدامات کے ساتھ آئین کو پامال کرتے ہوئے اقتدار و حکومت قائم کرنے کے لیے مارشل لا نافذ کر دیا۔ اُس نے اقتدار سنبھالتے ہی اہل قلم کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اس دورِ جہالت میں جاہل آمر نے اہل قلم و دانش کو تین میزانون کے ذریعے تو لے اور ان کے قلم و ضمیر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ اول تو اس نے منصب و دولت کے ذریعے ان نو اگروں کو خاموش کرانے کی کوشش کی۔ ثانیاً جو اہل علم و دانش برسرِ روزگار اور ملازمت پیشہ تھے۔ انہیں ملازمت سے نکالنے کی دھمکی دی گئی۔ سوم اہل قلم پر آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے قید و بند کی سزا دینے اور ملک بدر کرنے کی دھمکیوں کے ذریعے باضمیروں کے قلم و ضمیر خرید کر ان کی نغمہ خوانی اور آوازوں کو خاموش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہاں سے فراز کی مزاحمت کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس دور میں جمہوریت پسندوں، ادیبوں اور عوام پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

اس شہر میں نغمے بہنے دو
بستی میں ہمیں بھی رہنے دو
(بے آواز گلی کوچوں میں، ص ۱۰۳)

اس زمانے میں آمر کے نامعقول رویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انور زاہدی لکھتے ہیں کہ ”پاکستان کی سابقہ حکومتوں کے جابرانہ استبدادی دور میں سے بدترین عہدِ جنرل ضیاء الحق کا تھا۔۔۔ جبر کے خلاف بولنے والے کی یا تو قیمت لگائی گئی اور اگر اس میں ذرا سی بھی غیرت اور حمیت کا شائبہ نظر آیا۔۔۔ قید و بند کی صعوبتوں کے دروا ہوئے۔۔۔“ (۳۶)

آوازوں کو قتل کرنے کا رسمی اعلان تو ۱۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ہوا تھا۔ جب آمر نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تو وہ اقتدار کے نشے میں مست ہو کر شاہانہ انداز میں حکم صادر کرنے لگا تھا۔ اُس نے اپنی کوتاہ فکر اور سوچ کے

تحت قلم و قرطاس کے ذریعے تیرگی کو ضو و ضیا اور اجالے میں تبدیل کرنے والے ادیبوں کو تنگ کرنے کا سلسلہ جاری کیا۔ اس کی مخالفت میں آواز بلند کرنے والوں کا جینا محال اور عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ اس وقت کی توانا آوازوں میں سے ایک آواز فراز کی تھی۔ آخر کار وہ بھی ملک چھوڑ کر چلے گئے۔

ہم پانہار ہیں پھولوں کے
ہم خوشبو کے رکھوالے ہیں
تم کس کا لہو پیئے آئے
ہم پیار سکھانے والے ہیں
(بے آواز گلی کوچوں میں، ص ۱۰۴)

یہ بات تاریخ کا روشن باب ہے کہ پاکستان کا عوامی، حقیقی باغی اور مزاحم شاعر حبیب جالب اس دور تیرگی میں آمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرتا رہا۔ حبیب جالب کے قلم اور آواز خاموش کرنے کے لیے سخت سزائیں دی گئیں اور عقوبت خانوں کی سیر کرائی گئی۔ مگر یہ باضمیر شاعر زنداں میں رہنے، اور صعوبتوں سے گزرنے کے باوجود دورانِ قفس بھی اپنی تحریر و قلم کی طاقت سے ایوانِ اقتدار کی بنیادیں ہلاتا رہا۔ ضیاء الحق نے اکادمی ادبیات میں کانفرنس کے دوران تقریر کی اور اس نے اہل قلم کو احتیاط کے ساتھ جنبش دینے کا حکم دیا۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۹ء کے اخبار جنگ راولپنڈی میں اس کانفرنس اور ضیاء الحق کی تقریر کی خبر چھپ چکی تھی۔

"اہل قلم پاکستان کو اپنی تحریروں کا محور بنائیں۔ جو ادیب پاکستان کے ساتھ اپنے تشخص کو باعث شرم سمجھتے ہیں اس ملک سے فیض یاب ہونے کا حق نہیں رکھتے۔ نظریاتی بنیاد میں کمزور کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔" (۴۷)

فراز نے اپنے اشعار میں ان کی تمام باتوں کو نامعقول قرار دیتے ہوئے ان پر اس چمن اور اہل چمن سے غیر مخلص ہونے کا طنز کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے:

امیر شہر کے فرمان سب بجا لیکن
فقیر شہر بھی عرضِ حال کرتے ہیں

خطا معاف بصد احترام عہد و وفا
سکستے ہونٹ دکھے دل سوال کرتے ہیں

ہمیں توجان سے زیادہ عزیز در وطن
مگر حضور بھی ایسا خیال کرتے ہیں
(۲۳ مارچ، تنہا تھا، ص ۱۹۶)

آمر خود چور راستے کے ذریعے اس ملک کا سربراہ بنا تھا۔ اس نے اپنی تقریر میں تین باتیں کیں جو حقیقت میں دھمکی تھیں۔ خلوص اور وطن سے محبت رکھنے کی وجہ سے یہ باتیں نہیں کی گئی تھیں۔ فراز نے ان دھمکی آمیز اور غیر منطقی باتوں کو ایک ایک کر کے اس طرح رد کیا ہے کہ آمر کو اخلاقاً اور قانوناً اس طرح کی بات کرنا ہر گز زیب نہیں دیتا۔

آمر کی پہلی بات لغویت پر مشتمل تھی۔ اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ اہل قلم و دانش تو اس پاک وطن کو اپنا مسکن سمجھتے ہوئے اس سے محبت کا اظہار کرتے ہیں اور اس گلستان کی طرف چلنے والی بادِ مخالف اور زہریلی آندھیوں کی بھی نشاندہی کرتے رہتے ہیں۔ فراز کا خیال تھا کہ آمر باطنی طور پر خوف کھاتے ہوئے یہ حکم دے رہا تھا کہ پاکستان کو محور بنائیں۔ اس کی یہ بات غیر منطقی تھی۔ کیونکہ اہل قلم تو اس ارضِ پاک اور اس کے حالات کو موضوعِ سخن بنا رہے تھے۔ یہ لوگ وطن کی خاک سے بھی اپنی وابستگی پر فخر کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

اس کی دوسری بات بھی نامعقول تھی۔ ادیب اپنی دھرتی کو اپنا آشیانہ سمجھ کر رہتے ہیں۔ ان کے ہاں وطن کو ننگ و عار سمجھنے کا شائبہ بھی موجود نہیں ہوتا۔ ادیب لوگ تو اس بستی کو پھیلتا، پھولتا اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہوتا دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے لوگوں اور قوم میں قومی احساس اور شعور پیدا کرنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ملک حاصل کرنے کے اغراض و مقاصد سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ سیاسی، سماجی اور مذہبی آزادی کو ہر ایک کا حق ہونے کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اس کے باوجود صیادِ چمن نے باغبانوں کو اس طرح کی باتیں سنا کر ہرزہ سرائی کی تھی۔ تیسری بات یہ کی تھی 'بنیادیں کمزور کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔' اس بات پر غور کیا جائے تو عقل و شعور رکھنے والا انسان اس بات سے اختلاف کرتا نظر آئے گا۔ آمر خود ادیبوں پر

س لیے ظلم و ستم روا رکھتے ہوئے عقوبت خانوں میں دھکیل کر ان پر کوڑے برسارہا تھا کہ یہ لوگ اس نظریاتی مملکت کے اصول و قانون کی بالادستی کے لیے درس دے رہے تھے۔ یہ لوگ آئینی راستوں پر گامزن ہوتے ہوئے آئین شکنوں کی مذمت و مخالفت کرتے ہوئے نظریاتی مملکت کے نظریاتی اور سرحدی محافظوں کے سرداروں اور ہمنواؤں کو آئینی و قانونی آئینہ دکھا رہے تھے۔ ان قلم کاروں کی تحریروں سے آئین شکن آمر کے قصر اقتدار کو زمین بوس ہونے کا خطرہ لاحق تھا۔ ایک آئین شکن اور جمہوری قانون کو پاؤں تلے روندنے والا ڈکٹیٹر آئین و نظریات کی بات کر رہا تھا۔ یہ مذاق کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس کی آئین پسندی اور نظریات کے بارے میں وسعت اللہ لکھتے ہیں:

"۱۹۷۷ء میں ایرانی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا "آئین کیا ہے؟ دس یا بارہ صفحات کا کتابچہ؟ میں اسے ابھی پھاڑ کر کہہ سکتا ہوں کہ کل سے یہ ملک ایک نئے ضابطے کے تحت چلے گا۔ آج میں جہاں جاؤں لوگ پیچھے چلیں گے۔ اپنے وقت کے طاقتور بھٹو سمیت تمام سیاستدان بھی دم ہلاتے میرے پیچھے آئیں گے۔" (۳۸)

اس دور آمریت کے خلاف ان کی نظموں میں سے ایک مشہور نظم 'محاصرہ' ہے یہ نظم دور آمریت میں مقبول اور زبان زد عام تھی۔ ہر محفل میں اس نظم کی فرمائش ہوئی تھی۔ محاصرہ ایک طویل اور مزاحمت پر مشتمل خبریہ نظم ہے۔ اس نظم میں مزاحمت کا پہلو اور رنگ نمایاں ہے۔ اسی نظم میں فراز نے ڈکٹیٹر کی مخالفت، مذہب کے ٹھیکیداروں کی خواہش و لالچ کی مذمت اور عدالت میں بیٹھے ہوئے منصفوں سے سخت اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے کراچی کے کسی مشاعرہ میں نظم سنائی تو ان کو صوبہ بدری کا پروانہ ملا۔ اس مشاعرے کے رد عمل کا ذکر ڈاکٹر فاطمہ حسن نے کیا ہے کہ "اس مشاعرے میں حبیب جالب اور احمد فراز نے محفل لوٹی۔ کشور ناہید بھی محفل کو متاثر کر گئیں۔ صبح پتہ چلا کہ مشاعرہ گاہ سے ہوٹل پہنچتے ہی فراز اور حبیب جالب کا استقبال کرنے والے سرکاری کارندوں نے انہیں صوبہ بدری کا نوٹس دے دیا۔" (۳۹)

اس نظم کی تخلیق و حقیقت کے بارے میں جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا "مجھے اس قسم کا پیغام ایک بریگیڈیئر کے ذریعے سے بھیجوا گیا تھا۔ انہوں نے یہ نظم ڈکٹیٹر کے انتہائی غرور کے زمانے میں لکھی تھی۔ اس وقت صدا بلند کرنے والوں کو قید کر کے سزا دینے کا حکم جاری ہو چکا تھا۔ نظم 'محاصرہ' لکھنے پر آمر خفا ہوا اور ان کو جلا وطنی اختیار کرنا پڑا۔ اس نظم کے بارے میں محبوب ظفر لکھتے ہیں:

"محاصرہ، ایک ایسی نظم ہے کہ اس پورے عہد میں مزاحمتی شاعری کے حوالے سے کوئی اور ایسی نظم منظرِ عام پر نہیں آئی۔ بڑی شاعری دراصل ہر زمانے میں اپنا جواز آپ ہوتی ہے۔ فراز نے جب محاصرہ لکھی تو اس وقت ایک سیاہ رات چور دروازے سے ہماری زندگیوں میں در آئی تھی۔ یقین کو گمان نے منحصر کی سولی پر لٹکا دیا تھا۔ آوازیں تو کیا سہائے تک زندانوں میں دھکیل دیے گئے تھے۔" (۵۰)

اس نظم کی شہرت، اس وقت کے آمریت کے کردار اور پالیسیوں کے خلاف احمد فراز کی مزاحمت کے بارے میں زاہدہ جبین لکھتی ہیں کہ:

"یہ اپنے عہد کی مشہور نظم ہے۔ احمد فراز نے یہ نظم مارشل لا کے دور میں لکھی ہے۔ اس نظم کا ہر مصرعہ اپنے اندر مکمل مفہوم رکھتا ہے۔ مارشل لا کا یہ دور "سنہرا دور" تھا جس میں مسلمانوں کو نماز اور روزے کی طرح ہیر و من اور کلاشنکوف تحفے میں ملے۔ احمد فراز نے انہیں حالات کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ دوسروں کو بھی آواز بلند کرنے کا احساس دلایا تھا" (۵۱)

اس نظم میں اُس پیغام رساں آمر کو غنیم سے عبارت کر کے اُس پیغام کو ماننے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ ان کو مزید للکارا۔

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اس کے
فصیلِ شہر کے ہر بُرج ہر منارے پر
کمان بدست ستادہ ہیں عسکری اس کے
(محاصرہ، شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۹۱۴)

غنیم جو محافظ کا مخالف ہے۔ آمر نے اس غنیم کو لشکر و سپاہ کو شہروں کے گرد جمع کر کے تمام چوراہوں اور گلیوں میں اپنے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو کچلنے کی تیاری پر طنز کیا ہے۔ انھوں نے مصلحت پسندی کے سبب حق سے دست بردار ہو کر ظالم کے ہم نوا بننے والے مذہبی لوگوں پر بھی تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دربار کی طرف ہاتھ پھیلانے والے لوگ ہیں۔ اس دورِ آمریت میں کچھ پارٹی کے رہنما اور اسلامی دعویدار آمر کے ظلم کی تائید کرتے رہے تاکہ منصب و دام سے مستفید ہو سکیں۔ اُس وقت کی سیاسی جماعت اور خصوصاً مذہبی

جماعت کے سربراہ آمر کے شانہ بشانہ ہوتے تھے۔ یہی بات محمد فاروق قریشی نے لکھی ہے کہ مسلم لیگ پیر پگاڑا کی سربراہی میں اور جماعت اسلامی میاں طفیل محمد کی رہبری میں مکمل طور پر مارشل لا کے ہمنوا تھے۔

آمر کا پیغام یہ تھا کہ قلم کو قتل گاہ میں رکھیں یعنی وہ آمر طاقت کی زبان خاموش کرنا چاہتا تھا۔ فراز نے اس پیغام کا جواب انتہائی جدت کے ساتھ دیا ہے اس نظم کا تیور طیش پر مبنی ہے۔ انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں اپنا موقف بتا دیا ہے کہ وہ ظلم اور طاقت کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرنے کے بجائے آمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلے کرنے کو تیار ہیں۔ انہوں نے آمر کو عدو اور دشمن سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے طاقت اور لالچ سے نفرت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نہ دام کرم میں آنے والا ہوں اور نہ ہی خوف کی دیوار کھڑی کرنے سے مرے قدموں میں لغزش آسکتی ہے۔ بعض ادیبوں کا خیال یہ تھا کہ اگر فراز سر تسلیم خم کر لیتا اور اس سچ کو مان لیتا جو سچ نہیں تھا تو اس پر بھی مراعات کے دروازے کھل جاتے اُسے بھی کسی دربار میں اونچی مسند مل جاتی۔

مراقلم نہیں اس نقب زن کا دستِ ہوس
جو اپنے گھر ہی کی چھت میں شکاف ڈالتا ہے
مراقلم نہیں اس دُزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اُچھالتا ہے
(محاصرہ، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۹۷)

فراز نے یہاں کمان و تیر اور قلم کے درمیان فرق و قوت کا موازنہ کرنے کے بعد ان کی ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آمر کی انانیت، اپنی اصلی ذمہ داری اور پیشہ ورانہ زندگی سے چشم پوشی کر کے اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے پر ملامت کی ہے۔ وہ بڑے فخر سے کہتے نظر آتے ہیں کہ مراقلم کسی انسان کے اوپر ظلم نہیں کرتا۔ یہ آزادی انسانیت کے لیے اٹھتا ہے کسی کا حق سلب نہیں کرتا۔ ڈکٹیٹر ملک کی سرحدوں کا محافظ تھا لیکن اپنی اس عظیم ذمہ داری کو پس پشت ڈال کر اپنے ہی لوگوں ڈرا دھمکا رہا ہے۔ وہ اس بات کی تکرار کرتے ہیں کہ میں ہر ظلم کو ظلم سے عبارت کرتے ہوئے ظالم کی غلط سوچ اور بدینتی سے پردہ اٹھاتا ہوں گا۔ سب سے زیادہ خطرناک خیانت خود محافظوں کا صفت دُزد کے ساتھ اپنے ہی گھر کی چھتوں کو تہہ و بالا کرنا ہے۔ اب تو ملک کے محافظ اس کی حفاظت کرنے کے بجائے ملک کو توڑنے اور کمزور کرنے کے درپے ہیں۔

آمر کے کردار کے خلاف بول کر اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ جب کسی چھت میں خلل آجائے تو لیکن اس شگاف شدہ چھت کے زیر سایہ آرام و سکون کے ساتھ رہ نہیں سکتا، لیکن محافظین سرحد و نظریہ پاکستان اس قلعہ اسلام کی چھتوں میں شگاف کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ طاقتوری کے حوالے سے نازاں ہو کر بے چراغ گھر پہ قبضہ کر کے فخر کرتے ہیں لیکن عالمی طاقتوں کے ہاں گردن اٹھا کر بات کرنے اور نظریں ملا کر بات کرنے کی ہمت سے عاری ہیں۔ احمد فراز نے ان کی نیت و کردار کے بارے میں یہ تصور پیش کیا ہے کہ یہ ملک کی حفاظت اور دکھ درد رکھنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کو اقتدار سے غرض ہے۔ ملک ٹوٹ جائے یا سلامت رہے اس سے ان کو کوئی غرض نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی تو ملک دو لخت ہوا تھا۔

احمد فراز کی تحریر کی تشریح اور اصل مطلب کی طرف مراد خالد کاشمیری نے اشارہ کیا ہے کہ ”جس دور کا آغاز ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاس سے ہوا تھا اس نے پاکستان کو انتشار و خلفشار اور تعصبات کی راہوں سے شناسا کر دیا۔ میری رائے میں ضیاء الحق کا دور حکومت تحریک پاکستان کے مقاصد سے فراری کا عہد تھا۔“ (۵۲)

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقین ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا
(محاصرہ، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۹۱۸)

فراز قلم کی طاقت سے آگاہ تھے۔ اس لیے انھوں نے قلم کو شمشیر کے مقابلے میں پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ میرے قلم میں بہت طاقت ہے۔ اسی لیے آمر نے میرے ہتھیار یعنی میرے قلم کے مقابلے میں مسلح طاقت لانے کی بات کی ہے۔ فراز نے اس نکتے کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ جو طاقت و حکومت ابھی تمہارے ہاتھ میں ہے یہ دائمی تو نہیں کسی بھی وقت زلزلہ آکر ختم ہو سکتی ہے۔ آمر نے تیر تفنگ پر فخر کیا تھا لیکن فراز نے قلم پر نازاں ہوتے ہوئے بتایا ہے کہ میرے قلم میں بقا و دوام ہے۔ یہ آسمان پر بادلوں کی طرح یا موسموں کی طرح ہر گز نہیں۔ یہ مرا قلم اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک تاریخ موجود ہے۔ اگر

تیرا ذکر بھی آجائے تو تاریخ کے ماتھے پر سیاہ دھبہ کی طرح باقی رہے گا۔ اُنھوں نے یقین کے ساتھ اس کو دہراتے ہوئے کہا تھا:

آج ہم دارِ یہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں
(درِ آشوب، ص ۲۱۶)

احمد فراز کو ضیاء الحق کے طاقت کے غلط استعمال اور نشہ حکمرانی میں ہر طرح کے ظلم روار کھنے سے مکمل یقین ہو گیا تھا کہ یہ ملک کا خیر خواہ نہیں ہے۔ اس نے دو مرتبہ آئین کو بوٹوں تلے روند کر آئین کی بے حرمتی کی تھی اور آئین کے خلاف قدم اٹھانے والا کسی بھی وقت کسی بھی قیمت پر ملک کو تباہ بھی کر سکتا ہے۔ ضیاء الحق کے دور میں کی جانے والی زیادتی اور آئین کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یقیناً اس پر نقب زن اور نصف اللیل کا چور صدق آتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کی آئین کی رو سے اقتدار تک غیر جمہوری راستوں سے آنے اور حق حکمرانی کے بارے میں محمد فاروق قریشی لکھتے ہیں:

"۔۔۔ حالانکہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں فوج کا کردار واضح طور پر متعین ہے۔ اس کا کردار صرف ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ سول حکومت کے احکام کی تابعداری کرنا اس ادارہ کے اصل فرائض ہیں۔ اس کے علاوہ فوج کا کوئی کردار نہیں ہے۔ اگر کوئی طالع آزمایہ جوئی کرتا ہے تو اس کی سرگرمیاں آئین کے سراسر منافی ہیں۔" (۵۳)

وہ عجب صبح بہار تھی
کہ سحر سے نوحہ گری رہی
مری بستیاں تھیں دُھواں دُھواں
مرے گھر میں آگ بھری رہی
(شہر نامہ، پس انداز موسم، ص ۴۹)

ضیاء الحق کے دورِ آمریت میں ہونے والا اہم اور المناک حادثہ او جری کیمپ کا واقعہ ہے۔ اس انسانیت سوز و دلخراش واقعے میں ضیاء الحق براہِ راست ملوث تھا۔ اس کے حکم پر ہی یہ سب کچھ ہوا تھا۔ احمد فراز نے اس المناک حادثہ کا ذمہ دار اسی آمر کو ٹھہرا کر اس کی مذمت کی ہے۔ اس نظم میں وہ انسانوں کے قتل اور شہر کے

خاکستر ہونے پر نوحہ گر نظر آتا ہے۔ ۱۰ اپریل کے صبح بعض لوگ اپنے اپنے کاموں کے لیے گھروں سے نکل چکے تھے بعض تیارپوں میں مصروف تھے۔ ان تیرہ نصیبوں کو اس کا کہاں اس بات کا علم تھا کہ چند ساعتوں کے بعد اس شہر میں (او جڑی کیمپ) میں ایک خوفناک دھماکہ ہونے والا ہے۔ اس دھماکے کی نذر کتنی ماؤں کے ارمان ہو جائیں گے اور کتنے لوگ لقمہ اجل بن جائیں گے۔

کس کو علم تھا کہ وہاں پر موجود سپاہیوں کے علاوہ قرب و جوار کے کاروباری مراکز کھنڈر میں تبدیل ہونے والے ہیں اور اس شہر سے ملحقہ غریبوں کی پناگاہیں اور غریب خانے زمین بوس ہونے والے ہیں۔ اس صبح اچانک ایک خطرناک اور خوفناک آواز راولپنڈی اور اسلام آباد کی فضاؤں میں گونج اُٹھی۔ اس المناک جان سوز سانحے میں تقریباً چار ہزار لوگ بے خطا مارے گئے۔ لوگوں کے اعضاء ہر طرف بکھر گئے اور بعض لاشیں ناقابل شناخت ہو چکی تھیں۔ یقیناً جدید ہتھیاروں اور میزائلوں کی زد میں آئے ہوئے انسان کی پہچان کیسے ممکن ہو سکتی تھی۔ ہر طرف آہ وزاری تھی۔ لوگ اشکبار تھے اور اپنے اپنے پیاروں کی تلاش دیوانہ وار کر رہے تھے۔

فراز نے شہر نامہ کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں ضیاء الحق کے ظلم و سازش، قتل انسانیت کی جرأت کرنے اور سوداگری کرنے کی شدید مذمت کی ہے۔ وہ تمام سازش کاروں کی سازش سے سے آگاہ تھے۔ اس لیے اپنا درد اور موقف پوری شدت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس واقعے میں کئی آنکھوں کے خواب و خواہشوں کا خون ہوا ہے۔ احمد فراز نے س نظم میں ضیاء الحق پر اچھی طرح چوٹ کرتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت کی ہے کہ یہ واقعہ اس وجہ سے رونما ہوا کہ پاسبان بھی اپنی پاسبانی کو چھوڑ کر نقب زنی اور ڈاکہ زنی میں مصروف ہوا۔ وہ خفیہ طریقے سے اس ملک کو نوچنے پر خفا تھے۔ جب پاسبان ہی دزدِ راہ کی نیت سے قدم اٹھاتا ہے تو اس ملک کی صورتِ حال کیا ہوگی۔ اُنھوں نے سخت لہجے میں بیان کیا ہے کہ اب میرا ملک یتیم گمان ہوتا ہے، کوئی پرسان حال نہیں۔ اس واقعے کی تمام حقائق کے بارے میں جو کچھ طاہر مغل لکھتے ہیں اس سے احمد فراز کے خدشات کو تسلیم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ وہ لکھتے ہیں:

"جنرل اختر عبدالرحمن نے جو اپنے قریبی دوست جنرل ضیاء الحق کے ساتھ اس سانحہ کے تقریباً ۴ ماہ بعد ۷ اگست ۱۹۸۸ء کو ایک "ہوائی حادثہ" میں ہلاک ہو گئے تھے او جڑی کیمپ سے اسلحہ کی فراہمی اور تقسیم کی بہت گنگا میں خوب جی بھر کر ہاتھ

دھوئے۔۔۔ او جڑی کیمپ کے سانحہ کا ذمہ دار جنرل ضیاء الحق تھا اور اسی کے حکم پر

او جڑی کیمپ میں موجود اسلحہ کا ڈپو دھماکہ خیز مواد سے اڑا دیا گیا تھا۔" (۵۴)

احمد فراز نے ضیاء الحق کو لقب زن اور ملک لوٹنے والا اس لیے کہا تھا کہ اس نے اس شہر کے تمام سیاہ و سفید کا مالک بننے کے بعد بھی خواہش زر کی خاطر ذلالت کی راہ اپناتے ہوئے اسلحے کو فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ اس ملک سے خیانت کی۔ ضیاء الحق نے پاسبانی سے قاتل ہونے تک کا سفر بغیر کسی دقت کے طے کیا۔ اس نے اسلام و مذہب فروش گاہوں کو وہ اسلحہ فراہم کیا جو افغان جہاد میں استعمال کرنے کے لیے امریکا دیا کرتا تھا۔ اس کی سربراہی میں انہی ایام میں ملک کے بعض علاقوں میں باقاعدہ لشکر کشی کی گئی اور لشکر کشی کرنے والے جدید اسلحوں سے لیس تھے۔ جب اس نے ملک سے بددیانتی کرنے کے علاوہ عالمی سطح پر بھی خیانت کی تو عالمی طاقتیں اس سے تفتیش اور محاسبہ کرنے کے لیے آگئیں۔ تو اس نے اپنی چوری اور خیانت پر پردہ ڈالنے کے لیے اس بڑے المناک انسانیت سوز سانحہ کرانے سے دریغ نہیں کیا۔

کئی فاختاؤں کی چال میں

مجھے کرگسوں کا چمن لگا

(شہر نامہ، پس انداز موسم، ص ۵۴)

او جڑی کیمپ کے سانحے کی تحقیقات ہوئیں اور دو کمیٹیوں نے تحقیق کی۔ لیکن دریا میں تنکا پھینکنے کی مانند کسی پیشرفت کی آواز نہیں آئی۔ بعض کا خیال ہے کہ ضیاء الحق کو بھی اس کا ذمہ ار قرار دیا گیا تو انھوں نے اپنی ذاتی پسند سے لائے ہوئے وزیراعظم جونجو کی حکومت کو چلتا کر دیا۔

امیر شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے

کبھی بہ حیلہ مذہب کبھی بنام وطن

(درد آشوب، ص ۳۶)

احمد فراز نے اس شعر میں ضیاء الحق کے ملک اور غریب عوام کو لوٹنے کے طریقوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ آمر نے نہایت مکاری کے ساتھ اقتدار پر اپنی گرفت کو مضبوط کر کے اس کو دوام دینے کے لیے مختلف حیلے بہانوں سے عوام کو گمراہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس نے اقتدار کو طول دینے کے لیے مذہب، ضمیر اور غیرت کو نیلام کیا۔ ابتدا میں اس نے وطن کا کارڈ اور نام

استعمال کیا۔ دوسری راہ جو بہت ہی ناجائز اور غیر معقول تھی کہ اس نے مذہب کو بھی نہ بخشا۔ عوام کو فریب دینے اور گمراہ کرنے کے لیے ان کے مذہبی جذبات و جنونیت کو بھڑکایا۔ اس عظیم مملکت جس کی بنیاد اخوت و بھائی چارہ پر تھی میں ہجرت مدینہ کی تاریخ دہرائی گئی تھی۔ لیکن اس آمر نے اس عظیم نعمت کو اقتدار کی لالچ اور ہوسِ سیم و زر کے لیے ٹھکرا کر تعصب کی بُو پھیلانی اور تفرقہ بازی کا بازار گرم کر کے رکھ دیا۔

اگر تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو فراز کے آمر کی مخالفت کرنے کی وجوہات صحیح نظر آتی ہیں۔ آمر نے وطن کا نام لیتے ہوئے دو مرتبہ آئین کو پامال کر دیا۔ وطن کا نام لے کر دو مرتبہ جمہوریت کی طاقت سے بننے والی دو حکومتوں کو معزول کر کے وطن سے دشمنی کی۔ دوم یہ کہ آئین کی روشنی میں ان کی ذمہ داری سرحدوں کی حفاظت کرنا تھی لیکن آمر نشہ اقتدار میں اتنے اندھے ہو چکے تھے کہ انھوں نے اقتدار کے لیے سرحدی حفاظت کی ذمہ داری کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اس کی کوتاہی اور مذموم فعل طرف اشارہ کرتے ہوئے سید عالی رضوی لکھتے ہیں:

”۲۰ ہزار فٹ سے زائد بلندی پر واقعہ سیاچن گلیشیر کی جنگی لحاظ سے انتہائی اہم ۴۰ مربع میل کا علاقہ قیام پاکستان کے وقت ہی سے پاکستان کی ملکیت میں تھا۔ لیکن بھارت نے ۱۹۸۲ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔۔۔ بھارت ۱۹۸۲ء میں باقاعدہ فوج بھیج کر سیاچن کی سب سے اونچی چوٹیوں پر قبضہ کر لیا مگر جنرل ضیاء کی توجہ صرف اپنے اقتدار کو طول دینے کے منصوبوں کو بروئے کار لانے تک ہی محدود تھی۔“ (۵۵)

سوم یہ کہ ضیاء الحق نے جمہوری حکومت کو ختم کرنے کے بعد اپنی بادشاہت کو دوام دینے کے لیے فوج کو بدنام کیا جو ملک کی طاقت ایک قابل فخر ارادہ ہے۔ یہ بات ہر محبِ وطن جانتا ہے۔ جمہوریت سے جدا کرنے اور جمہوریت کے بارے میں فوج کے نظریے کو خراب کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس نے اپنی ذاتی اور شخصی خواہش کے لیے اس عسکری ادارے سے خیانت کی۔ عوام کو اس ادارے سے دور کرنے کی کوشش کی اور فوج کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ضائع ہونے نہیں دیا۔ مخالفت کرنے والوں پر نظریاتی غیر ہم آہنگی کی بنیاد پر تہمت لگا کر کوڑے برسائے جاتے تھے۔ کوڑے بھی فوج کے سپاہیوں کے ذریعے عوام پر برسائے جاتے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر کسی شخص پر الزام لگا کر سرِ عام کوڑے لگائے وہ بھی ملک کی آخری اُمیدوارہ فوج کی سپاہیوں کے ذریعے تو عام تاثر یہ جاتا ہے کہ اب فوج اپنی ہی عوام پر ظلم کرنے لگی ہے۔ دوسری بات جن

لوگوں کی پشت کارنگ کوڑوں سے تبدیل ہو گیا ہو وہ فوج کو ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے گا۔ فوجی افسروں کی توجہ اس بات کی طرف دلائی گئی کہ جمہوری حکومت کا قیام ہماری موت ہے کیونکہ وہ خود اپنی خیانت کی وجہ سے خائف تھا۔ منیر احمد اسی بات کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں:

”۔۔ چنانچہ ضیاء الحق پی پی پی کے جوشیلے رہنماؤں کی تقریروں کے کیسٹ سینئر جرنیلوں کو سنایا کرتے تھے۔ اس کا مقصد سینئر جرنیلوں کو اس بات پر تیار کرنا تھا کہ وہ بھی ہر صورت میں مارشل لا کے خلاف اٹھنے والی آوازوں پر توجہ نہ دیں۔ ورنہ دوسری صورت میں کئی جرنیل مارے جائیں گے۔“ (۵۶)

اس آمر نے کرسی کی خاطر مذہب کو استعمال کیا۔ لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو خود اسلام کے اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے حقوق سلب کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ فراز نے اشعار کے ذریعے اس کی اس مکروہ روش پر سخت تنقید کرتے ہوئے اس کی ساری باتوں کو غیر مستند قرار دیا ہے۔ اسلامی نکتہ نگاہ سے وعدہ خلافی ایک مذموم عمل ہے۔ وہ ابتدا میں وعدہ کر کے مکرمہ گیا یعنی اس نے ۹۰ دن کے اندر نظام کو جمہوری حکومت کے ہاتھوں میں دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن بعد میں قوم سے وعدہ خلافی کی۔ ان کے وعدے کا ذکر کرتے ہوئے مسعود الحسن نے لکھا ہے۔ ”۱۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ضیاء الحق نے اپنے اس فیصلے کا اعادہ کیا کہ انتخابات ۱۸ اکتوبر کو ہی ہوں گے اور انتخابات کے بعد اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کیا جائے گا۔“ (۵۷)

اس نے ریفرنڈم کرانے کا حکم دیا۔ ہر آمر اور جابر اپنے عمل اور کام کو آئینی اور انسانی رنگ دے کر جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ ریفرنڈم کرانے کے لیے ایسی شرط رکھی جو اسلام اور پاکستانی عوام کے ساتھ کھلا مذاق تھا۔ انھوں نے اس ریفرنڈم میں مذہب کو کارڈ کے طور پر استعمال کیا۔ اسی ریفرنڈم کے بارے میں ستار طاہر لکھتے ہیں:

”۔۔ اس ریفرنڈم کی بنیاد اس نکتے پر رکھی گئی کہ کیا پاکستان کے عوام یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں اسلامی نظام قائم ہو۔ اور اگر پاکستانی عوام یہ چاہتے ہیں تو پھر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انھوں نے جنرل ضیاء الحق کو مزید پانچ سال کے لیے حکمران منتخب کر لیا ہے۔ ایک عادی جھوٹے اقتدار کے بھوکے، اسلام کے آزادی اور مساوات کے زریں اصولوں اور

انسانی حقوق کی دھجیاں اڑانے والے جنرل ضیاء الحق۔۔۔ اسلام کے ہم معنی بن گئے۔" (۵۸)

کیا یہ حرکت، یہ جسارت اسلام کے تحت قابل معافی ہے۔"

کب ہم نے کہا تھا ہمیں دستار و قبا دو
ہم لوگ نوا گر ہیں ہمیں اذنِ نوا دو
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۸۳۶)

ضیاء الحق نے قلم و اخبارات سب پر پابندی عائد کر دی تو انہوں نے برملا اس حکم سے اختلاف کیا اور اپنے ضمیر کی آواز بلند کی۔ وہ یہ کہتے رہے کہ ہمیں کسی دولت و منصب سے سروکار نہیں۔ ہمارا اثاثہ ہماری آواز و صدا ہے اس پر پابندی قبول نہیں ہے۔ یہ ہمارا انسانی، اخلاقی، قانونی حق ہے کہ آزادی کے ساتھ جس وقت چاہیں جب چاہیں ہم اپنی آواز بلند کر سکتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ غیر آئینی اور ناجائز امور انجام دیتے ہوئے ملک میں تمام آزادیوں کو ختم کرنے اور پابندی لگانے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس مذموم عمل کی تصدیق جنگ اخبار کی اس خبر سے ہوتی ہے:

"سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دینے کے لیے مارشل لا ضابطہ جاری کر دیا گیا۔ راولپنڈی ۱۶ اکتوبر چیف مارشل لا ایڈمنسٹر جنرل محمد ضیاء الحق نے آج مارشل لا کا ضابطہ ۴۸ جاری کیا ہے جس کے تحت ملک میں تمام سیاسی پارٹیاں کالعدم قرار دے دی گئی ہیں۔ ضابطہ میں کہا گیا ہے کہ کوئی فرد بھی کسی پارٹی کا ممبر یا عہدیدار نہیں دے گا اور نہ ہی اس کے منشور کا پروپیگنڈہ کرے گا۔" (۵۹)

دوسری جگہ اس کی مخالفت کرنے والوں کا انجام کیا ہو گا اس کی وضاحت اس طرح کی گئی تھی کہ خلاف ورزی پر ۱۴ سال قید اور ۲۵ کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ ہر طرف وحشت و درندگی کا راج تھا۔ ملک کو جنگل بنا کر اس پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے کسی بھی نوعیت کا وار کرنے اور کمان بدست ہونے سے گریز نہیں کیا گیا۔ اس وقت لوگ دہشت اور اذیت میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اس دور کی بربریت کا نقشہ اس شعر میں پیش کیا ہے:

اس قدر خوف ہے اب شہر کی گلیوں میں کہ لوگ
چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ
(غزل بہانہ)

(کروں، ص ۵۴)

ایک طرف تو وہ پابندیاں عائد کرنے کا اعلان رہا تھا اور دوسری طرف بعض گداگرانِ سخن کو اپنی قصیدہ خوانی کے
لیے تیار کر کے ان پر نوازشات کی بارش ہو رہی تھی۔ یہاں یہ بات نہایت غور طلب ہے کہ انھوں نے ملک کو
بچانے کے لیے آوازیں اٹھانے والے لوگوں کی پر پابندی لگا دی۔ جبکہ اس ملک کو موت اور نیم مردگی میں
دھکیل کر ملکی سالمیت کے لیے خطرہ بننے والی چیزوں کو فروغ دینا شروع کر دیا۔ یہ نہایت تعجب آمیز حقیقت
تھی۔

کیا کہوں کس نے قبیلہ مرا تقسیم کیا
آج یوں ہے کوئی بسمل کوئی قاتل ٹھہرا

(شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۵۴۲)

ضیا الحق کے اس دور کی نحوست کے بارے میں مجاہد حسین لکھتے ہیں:

"اسی دور میں کلاشنکوف کلچر کی ابتداء ہوئی۔ ہیر وئن کی بین الاقوامی سطح پر سمگلنگ کا
آغاز ہوا۔ اقربا پروری، رشوت خوری اور پلاٹوں کی سیاست کا آغاز کیا گیا۔ صحافیوں کو
نوازا گیا اور من پسند جرنلسٹوں کو مراعات دی گئیں۔" (۶۰)

ضیا الحق نے عوامی آوازوں کو دبانے کے ساتھ ملک کے مقتدر اداروں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی
حمایت حاصل کرنے کے لیے زمینوں کو آفیسروں اور چہیتوں میں تقسیم کروایا۔ اس ظلم پر فراز نے آگ بگولہ
ہو کر لکھا ہے:

کیا مالِ غنیم تھا مرا شہر
کیوں لشکریوں میں بٹ گیا ہے

(شہرِ نامہ، پس انداز موسم، ص ۱۶)

آمر کے حکم پر لاہور میں طالب علموں پر گولی چلا کر چار طالب علموں کو مار دیا گیا۔ فراز اس ظلم کی مذمت کیے بغیر رہ نہ سکا اور اس ظلم کے خلاف پوری شدت کے ساتھ آواز اٹھائی۔

میں نے اب تک تمہارے قصیدے لکھے
اور آج اپنے نغموں سے شرمندہ ہوں
اپنے شعروں کی حرمت سے ہوں منفعل
اپنے فن کے تقاضوں سے شرمندہ ہوں
پابہ زنجیریوں سے شرمندہ ہوں
اپنے دل گیر پیاروں سے شرمندہ ہوں

(پیشہ ور قاتلو، ادبیات، ج ۱۸، ش ۸۱ ص ۱۶۵)

ان اشعار کے تناظر میں فراز کی مزاحمت کی شدت کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی مزاحمت پر مشتمل نظم 'پیشہ ور قاتلو' ضیاء الحق دور میں لکھی۔ اس میں درشت اور سخت لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ وہ آمر کی مخالفت میں یہاں تک چلے گئے کہ ۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء کی جنگ کے دوران لکھے گئے اپنے نغموں کو عبث قرار دے دیا۔ آمر و طاقتور حکمران اپنی ناکامی کو چھپانا چاہتے ہیں لیکن اگر کوئی اس حقیقت سے پردہ اٹھائے تو زیرِ عتاب آجاتا ہے۔ اسی لیے ان کو یہ نظم لکھنے کی پاداش میں سزا دی گئی۔ ان کی یہ نظم ابھی تک ان کے شعری مجموعوں اور کلیات میں شامل نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں مزاحمت اور حقیقت نگاری کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر فتح محمد ملک نے لکھا ہے کہ

"معرکہ ستمبر کے دوران اگر احمد فراز پر چم جان لے کر دادِ شجاعت دیتے نظر آتے ہیں تو سقوطِ ڈھاکہ کے گرد و پیش اپنے پندار کے ریزوں کو سمیٹے اور اپنے شیشہ جان کی کرچیوں کو چھتے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ قومی المیہ ہو یا ذاتی سانحہ ہم اپنی خامیاں گننے کی بجائے غیروں کی سازشوں کو ضرورت سے زیادہ اچھالنے کے عادی ہیں اس عادت نے ہمیں ہماری اپنی ذمہ داری کے احساس سے بڑی حد تک محروم کر رکھا ہے۔ فراز کا رویہ اسکے برعکس ہے۔" (۶۰)

انہوں نے اس عظیم مملکت کے دولخت ہونے کے الزامات کو خاص گروہ کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ اس نظم میں مشرقی پاکستان میں بغاوت کچلنے کا نام دے کر وہاں کیے جانے والے قتل اور حرمت پر حرف آنے تک کو واضح لفظوں میں بتا دیا ہے۔ وہاں پر قتل و غربت کے حالات پیدا کرنے کے علاوہ جنرل نیازی کی زبان کی تلوار سے وہاں کے جذبات و احساسات کو پارہ پارہ کرنے پر کڑی تنقید کی ہے۔ جنرل نیازی کا 'نسل تبدیل کرانے کا جملہ تاریخ کے اوراق پر بد نما داغ کی صورت میں موجود ہے انہوں نے اس پر لعن طعن کیا ہے۔ وہ اس نظم میں تنقید کا نشتر مسلسل چلاتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پہلے لوگ ان اداروں کو قومی اثاثہ اور محافظ سمجھتے ہوئے محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کی راہوں میں پلکیں بچھا کر عزت کرتے تھے۔ جب ان قوتوں نے اپنی ہی عوام کے خلاف طاقت آزمانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے تو لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں نفرت ابھرنے لگی ہے۔ طالب علموں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کرنے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے جس ترش لہجے میں اس نظم کو تحریر کیا تھا۔ اسے کافی شہرت بھی حاصل ہوئی اور لوگوں نے اس نظم کے بارے میں رائے بھی دی ہے۔ جیسے ڈاکٹر شاہ محمد مری لکھتے ہیں کہ ”مجھے یاد ہے جب ہمیں آمریت کو بہت موٹی گالی دینی ہوتی، تو ہم فراز کی یہ نظم پڑھا کرتے۔ اتنی خوبصورت نظم تو شاید خود بنگالیوں نے بھی نہ لکھی ہو۔“ (۱۲)

عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے والا

کوئی فراز سا کافر نہیں تھا غازی تھا

(غزل بہانہ کروں، ص ۱۰۹)

انہوں نے اس نظم کو مزاحمت کا اعلیٰ نمونہ اور شاہکار بنانے کی سعی کی ہے۔ اگر حقیقت میں جا کر اس کو پڑھیں تو یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ جب انہوں نے یہ نظم لکھی تو مزاحمت کا رنگ نہایت اعلیٰ تھا۔ اس شدید مزاحمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لوگ بھی اس کو آمر کے خلاف اظہارِ نفرت کی علامت سمجھتے تھے۔ عمیق نگاہ سے دیکھا جائے تو اس نظم کی تخلیق کے بعد کے حالات دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انکی شاعری میں مزاحمت کا جو رنگ نمایاں تھا وہ حقیقت تھا۔ ان کی مزاحمت کی حقیقت کھل کر سامنے آگئی کوئی بھی مزاحمت کا جب شدید اختلاف کرتا ہے تو وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہتا ہے۔ وہ مصلحت کا شکار نہیں ہوتا۔ ثابت قدم رہتا ہے۔ لیکن فراز آزمائش سے گزرنے کے بعد پابہ لرزاں تھے وہ اپنے موقف اور جذبات سے دست بردار ہوتے نظر آتے ہیں

یعنی ان کے ہاں حقیقی مزاحمت نہ ہونے کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے کیونکہ فراز اپنی اس نظم سے فرار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس بات کی دلیل اور وضاحت عابد حسن منٹو کی تحریر سے ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"بہر حال یہ نظم بغاوت کے نہیں صرف احتجاج کے جذبات کا اظہار کرتی ہے۔۔۔ کھلی عدالت میں سماعت کے بعد جج نے فراز کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس نظم کے بارے میں استفسار کیا۔ فراز نے کہا کہ وہ نہیں جانتا کہ نظم کس کی ہے۔ مجھے اس سے اس جواب کی امید نہیں تھی" (۶۳)

جبکہ حبیب جالب نے بھی سخت لہجے میں نظمیں لکھیں اور آمروں کا نام لیکر تنقید کی تھی اگر ان کے ہاں مزاحمت کا معیار ردیکھا جائے تو پختہ اور حقیقی پائی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ضیاء الحق کے زمانے میں قید و بند میں رہے لیکن اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ ایک بار ایک پیغام بردار آمر کا پیغام لیکر جالب کی کوٹھری میں آیا کہ اگر اپنی نظم میں سے ایک لفظ حذف یا تبدیل کرے تو رہائی کی نوید سنائی دی جائے گی لیکن جالب نے کہا کہ اس کے لیے میں ہر گز تیار نہیں یہ ایک عوامی امانت تھی میں نے حوالے کر دیا ہے، جالب نے ضیاء الحق کے پیغام کو پاؤں تلے روند ڈالا ایک لفظ بدلنے پر قید کی صعوبت کو گلے لگانے کو ترجیح دیا لیکن فراز نے عدالت میں اپنی لکھی ہوئی نظم سے انکار کر دیا۔

اب مرے دوسرے بازو پہ وہ شمشیر ہے جو
اس سے پہلے بھی مرا نصف بدن کاٹ چکی
اسی بندوق کی نالی ہے مری سمت کہ جو
اس سے پہلے مری شہ رگ کا لہو چاٹ چکی
۲۔ پھر وہی آگ در آئی ہے مری گلیوں میں
پھر مرے شہر میں بارود کی بو پھیلی ہے
پھر سے "تو کون ہے میں کون ہوں" آپس میں سوال
پھر وہی سوچ میانِ من و تو پھیلی ہے
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۱۵)

فراز نے آمریت کی ان مجرمانہ حرکات کو جو جمہوریت کی راہ کو مسدود کرنے اور جمہوریت پسندوں کو کمزور و ناکام کرنے کے عمل کا حصہ تھیں، سے اختلاف رکھتے ہوئے ایک نظم ”اے مرے سارے لوگو“ کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ ضیاء الحق نے اقتدار کو طول دینے کی خاطر صوفیوں کی سر زمین سندھ کو جہنم بنانے کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے اس نظم کے ذریعے لوگوں کو آمریت کی سازشوں سے باز رہنے کی ہدایت کی ہے اور ان کو آمروں کے سابقہ روایات اور تاریخ کے ذلت آمیز منظر کو دہرایا ہے۔ آمر اپنی کرسی بچانے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا اس لیے عوام کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے آمر کا ملک و قوم کی ترقی کو بالائے طاق رکھ کر اقتدار کی لالچ میں ملک کو ظلمت کی طرف دھکیلنے خصوصاً سندھ میں نئے فتنے برپا کرنے کی پالیسی کو نامناسب قرار دیا ہے۔ اس نے اس خون خرابے کی بنیاد کیوں اور کیسے رکھی اس کے بارے میں احمد سلیم لکھتے ہیں:

”۔۔۔ ۱۹۷۷ کے انتخابات کے بعد ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اس قبضے کو برقرار رکھنے کے لیے عوام کو آپس میں لڑانے کی منظم منصوبہ بندی کی۔ اسے لسانی اور نسلی بنیادوں قائم دلائل بازو کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ کوئی اتفاق نہیں کہ بھٹو کے عدالتی قتل سے کچھ عرصہ قبل ہی کراچی یونیورسٹی میں آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (اے پی ایم اس او) کا قیام عمل میں آیا اور سندھ کی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا“^(۶۴)

انہوں نے عوام کو باور کرانے کی کوشش کی کہ سندھ جیسی قدیم تہذیبوں پر مشتمل ملک کے زرخیز ترین حصے کو تہہ و بالا کرنے والا دشمن کوئی باہر سے نہیں آیا بلکہ طاقت کی تلوار و نیزے کو عوام کے سینوں میں پیوست کرنے والے ہاتھ شناسا تھے۔ سندھ کے عوام کو تاکید کی ہے کہ اتحاد و اخوت کے ساتھ رہیں کسی ظالم کی باتوں میں نہ آئیں۔ آمر لوگوں کو نسلی، لسانی فسادات کی دلدل میں پھنسانا چاہتا ہے بقول ان کے:

کسی غاصب کسی ظلم کسی قاتل کے لیے
خود کو تقسیم نہ کرنا مرے سارے لوگو
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۱۷)

ضیاء الحق پیپلز پارٹی سے اتنی دشمنی پر اتر آیا کہ اس نے پیپلز پارٹی کی جمہوری عمارت کو منہدم کرنے کے لیے پوری طاقت لگائی۔ اس کی راہ میں بڑی رکاوٹیں کھڑی کرنے کے ساتھ ساتھ سازشوں کا جال بچھایا اور سندھ میں ایک ایسی آگ لگا کر ملک دشمنی کا ثبوت خود ہی دیتا رہا۔

vi. مشرف دور کے خلاف مزاحمت

اس نے جب چاہنے والوں سے اطاعت چاہی

ہم نے آداب کہا اور اجازت چاہی

(اے عشق جنوں پیشہ، ص ۱۴۶)

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جنرل پرویز مشرف نے حکومت اس وقت ہاتھ میں لی جب سری لنکا کے دورے سے واپس آتے ہوئے ملک کی فضا میں ان کے جہاز کو چکر کاٹنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس وقت نواز شریف خفیہ ملاقاتوں کے ذریعے مشرف کو ہٹا کر نئے آرمی چیف کا اعلان کرنے میں مصروف تھے۔ پرویز مشرف جس جہاز میں سوار تھا اس کو ملک کے کسی بھی ایر پورٹ پر اتارنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ ان کے خلاف نواز شریف نے قدم اٹھایا تو آرمی چیف کے حکم اور فوج کے وقار کی خاطر آرمی کا حرکت میں آکر قدم اٹھانا لازمی امر تھا۔ جنرل پرویز مشرف نے مارشل لاء کا اعلان تو نہیں کیا تھا البتہ وہ فوجی قوت استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ جمہوری نظام کو چلانے کی کوشش کرتے رہے۔ جب اس نے حکومت سنبھالنے کا اعلان کیا تو سبھی نے خوش آئند قرار دیا اس میں فراز کو بھی استثناء حاصل نہیں ہے۔ اس وقت کے لوگوں کے تاثرات کو قلمبند کرتے ہوئے مسعود الحسن نے لکھا ہے کہ ”اس بار ۱۹۹۹ء کو جنرل پرویز مشرف نے مارشل لاء کا نام استعمال کیے بغیر اقتدار سنبھالا تو پاکستان کی اکثریت نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ اب انہیں ریلیف ضرور ملے گا۔ کرپشن اور لوٹ مار کا بازار گرم نہیں ہو گا۔“ (۶۵)

مشرف کے خلاف ان کی مخالفت کرنے کا سلسلہ کافی عرصہ بعد میں شروع ہوا۔ فراز کی ان کی مخالفت کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ جب قبائلی علاقے میں آرمی کی طرف سے آپریشن کا سلسلہ جاری ہوا تو وہ نسلی اور قبائلی نظریے کے حوالے سے ان کی مخالفت کرنے لگے۔ مشرف کے ساتھ ابتداء میں تعلقات کشیدہ نہیں تھے۔ جب نظریاتی اختلافات ہونے لگے تو فراز نے ان کی پالیسی ماننے سے انکار کر دیا اور اطاعت و وابستگی کی محفل برخواست کرتے ہوئے مخالفت کرنے لگے۔ ان میں قبائلی اور نسلی وزبانی تعصب غالب

ہونے کا شائبہ ہوتا ہے اور گمانِ غالب یہی ہے کہ انہوں نے پرویز مشرف کی مخالفت کا آغاز بھی اسی ذہنیت کے ساتھ کیا تھا۔ بقول عادل نجمی ”فراز نے ایک گفتگو میں کہا کہ وزیرستان اور بلوچستان کے عوام پر فوجی حملے سے مراد دل خون کے آنسو روتا ہے جسے آج ہم کشمیر کہتے ہیں وہ فوج نے نہیں بلکہ وزیر قبائلیوں نے آزاد کرایا تھا۔“ (۶۶)

اس عہدِ ظلم میں میں بھی شریک ہوں جیسے

میرا سکوت مجھے سخت مجرمانہ لگا

(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۵۱۳)

ان اشعار کے ذریعے فراز نے اپنے سکوت و خاموشی کا اقرار کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ پہلے مشرف کی حمایت کرتے چلے آ رہے تھے۔ جب ہم آہنگی نہ رہی تو مخالفت میں آواز بلند کی اور اپنے دور حمایت کو مجرمانہ قرار دیا۔ یہاں پر وہ کچھ زمانے تک شش و پنج میں مبتلا نظر آتے رہے۔ پرویز مشرف دور میں فراز کے نظریات کیا تھے اس کے بارے میں احسان اکبر لکھتے ہیں:

”میں یہ نہیں کہوں گا کہ فراز نے ترقی پسندانہ و تیروں کی داد دینے میں کوتاہی نہیں کی۔ کئی بار اسے دائیں بازو کے حقیقی ترقی پسند بھی دکھائی دیے جن کی اس نے داد نہ دی بلا شبہ یہ اس کی کوتاہی تھی۔ میاں نواز شریف کی حکومت الٹانے پر اس نے پرویز مشرف کو داد دی مگر اور کتنے دانشور تھے جنہوں نے سیاست سے بلند ہو کر فوجی جرنیل کی اس دراندازی کی مذمت کی تھی۔ اس گناہست کہ در شہر شامینز کنند۔“ (۶۷)

احمد فراز کی مزاحمت جس طرح سابق آمروں کے دور حکومت میں تھی وہ پرویز مشرف کے دور میں نہیں تھی۔ اس بات ذکر شاہ محمد مری کیا ہے کہ ”فراز کی مزاحمت تو مشرف آمریت کے دور میں بھی پھڑپھڑائی تھی۔ مگر یہ بوچھاڑ اس قدر زور دار نہ تھی جس قدر رچی اور ضیاء آمریتوں کے دور میں تھی“ (۶۸) سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ احمد ندیم قاسمی کو ضیاء الحق کے ہاتھ سے اعزاز لینے سے منع کرنے والے احمد فراز نے جنرل پرویز مشرف کے ہاتھ سے اعزاز لے لیا۔ مگر بعد میں اختلافات کی بنا پر احتجاجاً واپس کر دیا۔ اس سے مزاحمت کا رنگ واضح نہیں ہوتا۔ بہت سے شعرا نے ظالموں کے ہاتھوں سے اعزاز لینے سے انکار کیا ہے جیسے انڈیا کی مشہور و معروف

مصنفہ ارن دھتی رائے نے یہ کہہ کر محفل میں اعزاز لینے سے انکار کر دیا کہ تم لوگ کشمیریوں پر ظلم کر رہے ہو۔

سے ستم کے عہد میں چپ چاپ جی رہا ہوں فراز
سود و سروس کی طرح باضمیر میں بھی نہ تھا
(جاناں جاناں، ص ۶۷)

جنرل پرویز مشرف نے جب اقتدار سنبھالا تو اس وقت تقریباً چار پانچ سال تک فراز ان کے حامی رہے۔ اس وقت ان کا موقف یہ تھا کہ جہاں تک جنرل مشرف کے آنے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس میں فوج کا کوئی قصور نہیں بلکہ نواز شریف صاحب نے کوتاہ اندیشی سے کام لیا کہ ان کے طیارے کو پاکستان میں اترنے سے روک دیا۔ حقیقتاً جنرل پرویز مشرف کا رد عمل اتنا شدید نہیں تھا جتنا ان باقی جرنیلوں کا تھا۔ جنرل مشرف نے آتے ہی اچھا تاثر دیا اور کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی۔ مشرف کے دور میں انہوں نے اختلافات کا اظہار کرتے ہوئے کچھ اشعار لکھے ہیں ان میں ایک یہ ہے:

باغبان ڈال رہا ہے گل و گلزار پہ خاک
اب بھی میں چپ ہوں تو مجھ پر مرے دستار پہ خاک
(اے عشق جنون پیشہ، ص ۱۶۵)

ح۔ مقامی سیاست کے خلاف مزاحمت

اے یارِ خوش دیار تجھے کیا خبر کہ میں
کب سے اداسیوں کے گھنے جنگلوں میں ہوں
(نایافت، ص ۲۱)

تحریک پاکستان سے لیکر قیام پاکستان تک مسلم قوم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے اور بانی پاکستان کی مخلصانہ قیادت کے زیر نگرانی مسلسل آگے بڑھتی رہی قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ "جمہوریت ہمارے خون میں شامل ہے یہ ہماری رگ میں رچی ہوئی ہے۔" بانی پاکستان پر عوام بلاتامل اعتماد کرتے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ بنگال کے لوگوں نے بھی قائد اعظم پر اس وقت بھی اعتماد کیا جب قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر قیادت اردو زبان کو قومی زبان قرار دے دیا گیا۔ اس وقت انہوں نے بڑی سطح پر یا کوئی کلی مخالفت نہیں کی۔ مسلم لیگ اور

عوام میں سر اور دھڑکا رشتہ تھا۔ جب قائد اعظم محمد علی جناح رحلت کر گئے تو نہ صرف مخلص قیادت کا فقدان ہو گیا بلکہ سیاسی سطح پر بھی بہت بڑا خلا پیدا ہوا جو آج تک محسوس کیا جاسکتا ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح عوام کی نظر میں کیا ہیں اور ان کے نظریات کیا تھے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں؛

”جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔ وہ عوام کے لیے اعتماد کا سرچشمہ تھے۔ کابینہ میں ان کی رائے قانون کا درجہ رکھتی تھی۔ عوام میں ان کی غیر مقبولیت اور اعتماد کا عالم یہ تھا کہ کبیتہ کلارڈ کے بقول 'ان کی ذات ملک کا دوسرا نام تھی' ان کی طاقت کا منبع ان کا عہدہ نہیں بلکہ عوام کے ساتھ ان کا تعلق تھا۔۔۔ قائد اعظم جمہوریت کے بہت بڑے داعی تھے اگر وہ زندہ رہتے تو جمہوری ادارے ان کی سرپرستی میں خوب فروغ پاتے،“ (۶۹)

جب پاکستان کو تخلیق کرنے والی اس تنظیم کی تقسیم بندی ہو گئی تو جاگیر دار اور اقتدار کے طلبگاروں نے عوام اور ملک کے مفادات کی نسبت منصب اور عہدوں کو فوقیت دی۔ اس طریقے سے حکمران و سیاستدان عوام سے دور ہوتے چلے گئے۔ پاکستان کی سیاست میں اقتدار کے لیے گھسنے والوں کی نیت و کردار اور خلوص سے قائد اعظم واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کئی بار ان کی سرزنش کی۔ سرمایہ دار اور انگریزوں کے وفادار لوگ پاکستان کی سیاست میں نمایاں ہوتے رہے۔ قائد اعظم انہیں کھوٹے سکوں کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان موقع پرستوں، جاگیر داروں اور سیاست دانوں نے اقتدار کی کرسی اور سیاست پر قبضہ جمالیا۔

احمد فراز سیاست دانوں کے اس رویے سے خوب آگاہ تھے کہ عوامی حمایت اور عوامی طاقت کے بل بوتے پر اقتدار حاصل کرنے والے سیاست دان غیر مخلص اور عوام کے خیر خواہ نہیں ہوتے ہیں۔ اس ملک میں جمہوری نظام کے پھیلنے اور قائم رہنے میں سرمایہ دارانہ نظام ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ وکیل محمد انجم اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

”چنانچہ ہمارے یہاں جاگیر داری نظام جمہوری نظام کو بار بار کھاتا چلا جا رہا ہے۔ یہ دونوں نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگرچہ جمہوری نظام مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتا تو وہ جاگیر داری نظام کو کھا جاتا۔ لیکن ہمارے ہاں جاگیر داری نظام اتنا مضبوط ہے کہ وہ جمہوری نظام کی جڑ لگنے ہی نہیں۔“ (۷۰)

اس ملک کی عوام جمہوریت پسند ہیں۔ وہ جمہوری نظام کو ہر حال میں مقدم اور مقدس سمجھتی ہے اور اس نظام کے ساتھ تعلق اور وابستگی کو پختہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ایوب دور میں معاشی اصلاحات کے باوجود عوام نے ان کی مخالفت صرف اور صرف جمہوریت کی بقا کی خاطر کی تھی۔ عوام انہی مفاد پرست سیاست دانوں کی وجہ سے مایوس ہوتی ہے۔ عوام ان سیاست دانوں کو اس امید کے ساتھ منتخب کرتی ہے یہ لوگ عوامی حقوق کی بحالی اور پاسداری کے لیے اقدامات کریں لیکن اس کے برعکس یہ لوگ عوام کے حقوق کو سلب کرتے ہیں۔ اس صورت میں عوام سیاست دانوں کی منافقت اور ذات کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور مجبور ہو کر غیر جمہوری طاقتوں کی طرف امید کی نگاہ سے دیکھنے لگتی ہے۔ مسعود الحسن نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے ”پاکستانی عوام نے ہمیشہ مارشل لاء کو اس لیے قبول کیا کہ وہ سیاست دانوں کی نااہلیوں، بدعنوانیوں اور اقربا پروریوں، سازشوں اور عوام دشمنی پالیسیوں سے تنگ آ جاتے تھے۔“ (۷۱)

یہ مملکت تو سبھی کی ہے خواب سب کا ہے

یہاں یہ قافلہ رنگ و بو اگر ٹھہرے

تو حسن خیمہ برگ گلاب سب کا ہے

یہاں خزاں کے بگولے اٹھیں تو ہم نفو

چراغ سب کے بچھیں گر عذاب سب کا ہے

(سبھی شریک سفر ہیں، شب خون، ص ۹)

فراز نے نے جمہوریت کی حمایت کرتے ہوئے اپنی زندگی گزاری اور اقتدار کو طشت میں رکھ کر آمرؤں کو دعوت دینے والے سیاست دانوں کی مخالفت کی۔ ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والوں میں سیاست دان سب سے آگے ہیں۔ انہوں نے ہوس اقتدار کی خاطر جمہوری نظام کی پاسداری کی اور نہ ہی عوامی حکومت کو خود قبول کیا۔ سیاست دان ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہوئے ایک دوسرے کی جمہوری حکومت گرانے کی کوشش اور موقع تلاش کرتے رہے۔ حصول اقتدار کے لیے جمہوری راستوں کو خود ہی محدود کرتے رہے۔

احمد فراز کی مخالفت و مزاحمت آمریت تک محدود نہ رہنے کی ایک وجہ یہی تھی کہ ملک کے نااہل سیاست دان کرسی کی خاطر ہر وقت آمروں کے زیر سایہ رہ کر ان کی حمایت حاصل کرنے کے درپے رہے۔ اس تاریک ترین تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منیر احمدیوں رقمطراز ہیں کہ:

”ہمارے ہاں ایسے سیاستدانوں کی کمی نہیں جو بیلٹ کے ذریعے اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے اور ان کے لیے اقتدار کا راستہ چور دروازہ ہے جس کی چابی کسی نہ کسی جرنیل کے پاس ہر وقت موجود رہتی ہے۔ غلام محمد نے اپنی کرسی سجانے کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کو اقتدار سے الگ کرنے کے لئے جرنیلوں کا سہارا لیا۔“ (۷۲)

سیاست دانوں کے جمہوری اقدار کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے ملک دو نیم ہوا۔ اس واقعے میں سیاست دانوں کا بڑا کردار رہا ہے۔ اقتدار کی رسہ کشی میں ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا۔ جمہوریت اور ملک کے لیے نعرہ لگانے والے دوسری جمہوری قوتوں کو برداشت نہ کر پائے۔ بقول گوہر ایوب کے ”جنرل یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔ بھٹو نے مطالبہ کیا کہ ملک میں دو وزیراعظم ہونے چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر شیخ مجیب سمجھتے ہیں کہ وہ مغربی پاکستان کی دیگر جماعتوں کو ساتھ ملا کر حکومت بنالیں گے اور ہم اپوزیشن میں بیٹھیں گے تو مجھے ہر گز قبول نہیں۔“ (۷۳) سیاست دانوں نے ایک دوسرے کو گرانے کے لئے جمہوری اقدار کو پامال کیا اور تعصب اور لسانیت کو ہوا دے کر عوام کو تقسیم کر کے بد امنی کی طرف دھکیل دیا۔ نیز اب تک مخالف سیاسی جماعت کی مخالفت میں تمام جمہوری و اخلاقی حدود عبور کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ، جب بھٹو نے پنجاب سے انتخاب لڑنے کا اعلان کیا تو اس وقت جماعت اسلامی کے سربراہ نواب مشتاق احمد گرمائی نے تنقید کر کے عوام میں تعصب ڈالتے ہوئے کہا کہ مسٹر بھٹو کا پنجاب سے انتخاب لڑنا پنجابیوں کے لیے چیلنج ہے۔ انہوں نے لسانی اور صوبائی تعصب کو فروغ دیتے ہوئے بھٹو کی مخالفت کی۔ یہی نعرہ نواز شریف نے بھی بلند کیا تھا۔ انہوں نے مخالف جماعت کو شکست دینے کے لیے نعرے لگانے کے ساتھ ساتھ تمام مشنری استعمال کی۔ اس واقعے کو منیر احمد نے اس طرح بیان کیا ہے ”نواز شریف نے دیکھا کہ مرکز میں پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی ہے تو انہوں نے جاگ پنجابی جاگ، کا نعرہ لگایا دوسری طرف تمام صوبوں کی ضلعی انتظامیہ کو اوپر سے احکامات موصول ہوئے کہ اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدواروں کو صوبائی انتخابات میں کامیاب کرایا جائے۔“ (۷۴)

یہ ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں قتل گاہوں کو
 دراصل چارہ گروں کو تلاش کرتے ہیں
 (شہر سخن راستہ ہے، ص ۱۵۵۱)

ملک کے لیے جمہوری نظام سودمند ہے۔ اس لیے فراز ہر وقت مخلص اور سیاسی بصیرت رکھنے والے رہنماؤں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ دور پر فتن میں اس ملک و قوم کے لیے سوچنے والوں کی ضرورت ہے۔ فراز ایسے افراد کے تعاقب میں رہے جو ملک کی نمو و ترقی کی خواہش رکھتے تھے۔ وہ ملک کے لیے اہل علم اور اہلیت کے مالک افراد کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے رہے۔

مسیحاؤں کو جب آواز دی ہے
 پلٹ کر آگئے ہر بار قاتل
 (شہر سخن راستہ ہے، ص ۱۳۳۹)

انہوں نے جمہوریت کی عدم بقا اور زوال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب بھی ملک و قوم مخلص سیاست دانوں، عوامی نمائندگی کرنے والوں کو آواز دیتی ہے تو باد مخالف چلنے لگتی ہے۔ جب بھی دھندلی فضا کو ختم کرنے کی خواہش لیکر عوام کسی مسیحا کی آمد و استقبال کے لیے مقدمہ و ضمیمہ فراہم کرنے لگتی ہے تو ان کی خواہشوں کا خون ہو جاتا ہے۔ انہوں نے عوام کی خواہش اور ذہنیت کو بیان کیا ہے کہ عوام تو ہر وقت اپنی نمائندگی کرنے اور دکھ درد میں شامل ہونے والوں کو برسر اقتدار دیکھنا چاہتی ہے لیکن وہ لوگ یعنی سیاست دان ان کے توقعات پر پورا اترتے نظر نہیں آتے۔

غارت گر چمن سے عقیدت تھی کس قدر
 شاخوں نے خود اتار دیے اپنے پیر ہن
 (شہر سخن راستہ ہے، ص ۲۸۶)

ہمارے ملکی تاریخ میں یہ بات واضح اور روشن ہے کہ بعض سیاست دان آمریت کے لیے صرف نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے ساتھ دلی محبت اور عقیدت رکھتے تھے اور ان کی ہر آواز پر لبیک کہتے رہے اس لیے اپنی شاعری کے ذریعے فراز نے ان سیاسی افراد سے بیزاری کا اعلان کیا ہے۔

اسلامی جمہوری مملکت پاکستان کی ترقی صرف اور صرف جمہوری نظام میں مضمر ہے۔ لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اس ملک کے عوام کی آواز بن کر ان کی نمائندگی کرنے کا دعویٰ کرنے والے اور جمہوریت

کے لیے دکھاوے کی کوشش کرنے والے سیاست دانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت ہی سیاہ ترین تاریخ دکھائی دیتی ہے۔ سیاست دان خود آمریت کے ہاتھ مضبوط کر کے ہر قدم پر جمہوری نظام کو ناکارہ کرنے کے لیے تمام حربے استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ عوامی نمائندہ بن کر پھرنے والے ہی جمہوریت دشمن نکل آتے ہیں۔ یہ سیاست دان اپنی عزت وقار مجروح کرنے کے علاوہ جمہوری راہ کو بھی مسدود کرتے ہوئے اقتدار تک پہنچنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ آمریت کو انہی منافق سیاست دانوں کی وجہ سے اقتدار تک آنے کی ہمت و حوصلہ مل جاتا ہے اس ضمن میں یحییٰ خان کی بات کو نقل کرتے ہوئے مسعود الحسن لکھتے ہیں کہ ”میں آج ان سیاست دانوں سے تو مل رہا ہوں جو ایوب خان کے ساتھ ساز باز کر کے گورنر، وزیر اعلیٰ یا دیگر اہم عہدوں پر فائز ہونا چاہتے تھے۔“ (۷۵)

جمہوریت کا نعرہ لگا کر عملی میدان میں خیانت کرنے والوں کو احمد فراز قومی مجرم تصور کرتے تھے۔ ایسی فکر و روش اور طریقہ اختیار کرنے والوں میں ہر جماعت کے لوگ شامل ہیں کسی کو بھی کوئی استثنیٰ حاصل نہیں ہے۔ میاں نواز شریف ضیاء الحق کا معتمد خاص رہا ہے اس نے بھی جمہوری نظام کو گرد آلود کر کے ضیاء الحق کی مکمل حمایت کا اعلان کیا۔ احمد فراز جس طرح آمریت کو شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ان کا یہی رویہ ان سیاست دانوں کے ساتھ بھی تھا جو جمہوری نظام اور جمہوری صفوں میں شامل ہو کر جمہوریت کا گلا گھونٹتے رہے۔ نواز شریف ضیاء الحق کے تمام اقدامات کی حمایت کرتے رہے یہاں تک کہ جمہوری نظام تحلیل کرنے اور حکومت کو برخاست کرنے کو بھی آمر کی عقیدت و محبت میں جائز اور آئینی قرار دیا۔ اس سے زیادہ اور کیا ستم ہو سکتا ہے کہ اس ملک و قوم میں آئین کا نعرہ بلند کرنے والے غیر آئینی اقدام کو عین آئینی و قانونی قرار دے دیا جائے۔ اس غیر آئینی نظریہ رکھنے کے حوالے سے یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ ۳ جون ۱۹۸۸ء کو نگران وزیر اعلیٰ نواز شریف نے اسلام آباد ایئر پورٹ پر اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے ضیاء الحق کے اقدامات کو ملک کے بہترین مفاد میں فرار دیا۔

اسی طرح اگر پیپلز پارٹی کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو وہاں بھی یہی رنگ نظر آتا ہے۔ اس جماعت کے بانی ذوالفقار علی بھٹو نے بھی آمریت کے ساتھ کام کیا اور مارشل لاء ایڈمنسٹر رہے۔ بھٹو بھی تقریباً آٹھ، نو سال آمریت کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اس تاریخ کو گو گو ہر ایوب اس طرح لکھتے ہیں:

”بھٹو نے ہمیشہ جنرل یحییٰ خان کے ساتھ صلح جو یا نہ تعلق رکھا (شاید یہ ہم پیالہ ہونے کا اثر تھا) دوسری طرف بھٹو ڈیل گیم بھی کھیلتا رہا، درحقیقت دونوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ بھٹو کو مجیب الرحمن کی مخالفت کے لیے فوج کی سپورٹ درکار تھا اور جنرل یحییٰ خان کو صدر رہنے کے لیے بھٹو کی حمایت درکار تھی۔“ (۷۶)

بعض سیاست دان آمریت سے اپنی پوری ہمدردی دکھانے کے لیے پیپلز پارٹی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنے کی تلقین کرتے رہے۔ بقول مسعود الحسن ”۸ دسمبر کو ولی خان کو بغاوت کے مقدمے سے بری کر دیا گیا۔ حکومت نے دیگر مقدمات واپس لے کر ولی خان کو ساتھیوں سمیت رہا کر دیا۔ چنانچہ ۱۳ دسمبر کو ولی خان نے جنرل ضیا الحق سے ملاقات کی۔ بیگم نسیم ولی خان بھی ان کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے جنرل ضیا الحق سے کہا کہ بھٹو ازم جہاں بھی نظر آئے اسے ختم کر دیں۔“ (۷۷)

اس جمہوریت کش نظریے کو اپنانے والے سیاست دانوں میں جماعت اسلامی کے رہنما بھی پیچھے نہ رہے۔ انہوں نے نہ صرف ضیاء الحق کی حمایت کی بلکہ اس دور کے سخت حالات کو معمول پر لانے کے لئے انوکھا مشورہ بھی دے ڈالا۔ ان کا یہ مشورہ قومی اخبارات میں شہ سرخی کے طور پر شائع ہوا۔ جنگ راولپنڈی میں یہ خبر چھپی تھی کہ

”راولپنڈی ۳ اپریل (ب ب ا) پاکستان قومی اتحاد کے مرکزی رہنما اور جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد نے آج میاں صدر جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات سوا گھنٹہ جاری رہی۔۔۔ ایک اور سوال کے جواب میں میاں طفیل نے کہا کہ اگر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی تو موجودہ بے یقینی کی کیفیت ختم ہو جائے گی۔“ (۷۸)

۱۔ امکان میں ہے تو بند و سلاسل پہن کے چل
یہ حوصلہ نہیں ہے تو زندان کے در نہ کھول
(جاناں جاناں، ص ۷۷)

فراز کے دل میں ان سیاستدانوں کے لیے محبت تھی جو عوام اور ملک کے لیے ہر قربانی دینے، جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو کر ارادہ و قوت اور یقین کے ساتھ سیاسی رزم گاہ میں قدم رکھتے اور آخری دم تک اپنے آئینی اور قومی نظریے اور موقف پر ڈٹے رہتے تھے۔ لیکن فرازان سیاست دانوں سے اظہارِ بیزاری کرتے رہے جو نہ صرف عوامی و قومی خدمت کرنے سے ناکام و عاری تھے بلکہ وہ اپنی کرسی کے لیے جھوٹے نعروں کے ذریعے سادہ عوام کو بیوقوف بنا کر آمریت کے ہمنوا اور ہم پیالہ رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سیاسی میدان ملک میں ایک خارستان کی حیثیت رکھتا ہے جب تک آبلہ پا ہوتے ہوئے چلنے کی ہمت نہ ہو تو اس میدان میں قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ اس خارزار کو عبور کر کے ہی گلستان کی آبیاری ممکن ہوتا ہے۔

چھاؤں میں بیٹھنے والی تو سب سے پہلے

پیڑ گرتا ہے تو آجاتے ہیں آر لے کر

(شہر سخن راستہ ہے، ص ۱۵۵۴)

انہوں نے ان بے ضمیر سیاست دانوں اور جمہوریت کے میدان میں منحوس قدم رکھنے والے افراد پر طنز کیا ہے کہ انہی سیاست دانوں میں سے اکثریت اپنے تمام تر ذاتی مفاد کی خاطر آمروں کی قیام گاہوں کی درباری کرتے ہوئے ان سے اپنی وابستگی کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔ جب کبھی ان کو آمریت کی زیر دستی نظر آجائے تو یہ سیاستدان ان کی مخالفت میں اپنے آپ کو جرأت مند دکھاتے ہوئے اڈ کر بلوں سے باہر نکلتے ہیں۔ لیکن جب کایا پلٹ جاتی ہے تو یہی لوگ اسی آمریت کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ احمد فرازان سیاسی راہیوں کو مصلحت پسندی کی مضبوط عمارت و مکین گاہوں کے مکین سمجھتے تھے۔ سیاست دانوں کے مصلحت پسندی کا شکار رہنے اور راہ اختلاف اپنانے کے حوالے سے امیر عبد اللہ خان روکڑی لکھتے ہیں؛

"مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کو ڈیڈی کہتے تھے لیکن جب تاشقند معاہدہ پر

اختلافات رونما ہوئے تو مسٹر بھٹو کو وزارت خارجہ کا قلمدان چھوڑنا پڑا۔ پہلے تو انہوں

نے سیاست میں آنے سے گریز کی پالیسی اپنائی کیونکہ وہ نواب کالا باغ کے سخت

گیر مزاج سے خوفزدہ تھے لیکن نواب کالا باغ کی گورنر شپ سے سبک دوشی کے بعد

انہوں نے پر پرزے نکالنے کے شروع کئے اور اپنی جماعت پیپلز پارٹی کی بنیاد

رکھی۔ مسٹر بھٹو کے دل میں ایوب خان سے انتقام لینے کی زبردست خواہش تھی" (۷۹)

ہمارے ملک کے سیاستدان کتنے مرعوب اور بزدل ہوتے ہیں اس کا ذکر ہمیں پرویز مشرف کا جہاز کراچی ایئرپورٹ پر اترنے سے پہلے کے واقعات کے تناظر میں ملتا ہے۔ جب نواز شریف کے حکم پر سید غوث علی شاہ رانا مقبول کراچی ایئرپورٹ پر ہونے والے حادثات اور حالات و واقعات کی خبر ان کو دے رہے تھے۔ اس دوران ان کی ملاقات سابق ڈی آئی جی محمد اکبر آرائیں سے ہوئی۔ اور انہوں نے کہا کہ پرویز مشرف کو لینڈ کرنے سے منع کرنا مناسب نہیں ہے اور نہ ہی ممکن کیونکہ فوج آگئی ہے بہتر ہے کہ آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ یہ بات بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ یہ بات سنتے ہی سید غوث علی شاہ اور رانا مقبول احمد تیز تیز قدموں سے وہاں سے چلے گئے۔

گوسیہ بخت ہیں ہم لوگ پہ روشن ہے ضمیر
خود اندھیرے میں ہیں دنیا کو دکھاتے ہیں چراغ
(تہا تھا، ص ۱۷۳)

فراز کے نیشنل بک فاؤنڈیشن مین ملازمت کے دوران یونیسکو نے بلوچستان میں شرح خواندگی بڑھانے اور تعلیم عام کرنے کے لئے تقریباً دو کروڑ کی گرانٹ دی تھی۔ ان کی شرط یہ تھی کہ اس رقم سے کتابیں شائع کر کے تقسیم کریں۔ انہوں نے اس سلسلے میں بلوچستان میں موجود اپنے کسی نمائندے سے رابطہ کیا اور تفصیلات بتائیں لیکن اس کا جواب حیران کن اور غیر متوقع تھا۔ اس نمائندے نے کہا کہ وہاں کا سیاستدان جو ان دنوں وفاقی حکومت میں شامل تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس رقم کا ۲۰ فیصد حصہ اس کا ہوگا۔

انہوں نے اس طرح کے علم دشمن، ترقی دشمن عناصر کی ذہنیت اور سوچ کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس طرح کے سیاست دان حقیقت میں شمع فروزاں کو گل کر کے ظلمت و تاریکی میں زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ضیائے فہم و دانش سے دور رکھنے والے ہیں۔ عوام کو شعور و آگہی حاصل ہونے کے سخت مخالف ہیں۔ یہی سیاست دان اپنے علاقوں میں سکول کھولنے کی مخالفت کرتے ہیں جبکہ شہروں میں تعلیم کے نام پر بڑے پیمانے پر تجارت کرتے نظر آتے ہیں اور ان کی اپنی اولاد باہر ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہوتی ہے۔

میں تو ہر طرح کے اسباب ہلاکت دیکھوں
اے وطن کاش تجھے اب کے سلامت دیکھوں
(ناینا شہر میں آئینہ، ص ۳۵)

فراز نے دیکھا کہ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کی مخالفت میں ہمیشہ دست و گریباں رہتی ہیں۔ اگر اپنی جماعت کی حکومت قائم ہو جائے تو ٹھیک و گرنہ دوسری جماعت کی حکومت کو قبول کرنے کی روایت کم ہی رہی ہے۔ دوسری جماعت کی حکومت کو پٹری سے اتارنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے جمہوری نظام کو ناتلانی نقصان ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ملک کے آئین و قانون سے کھیلنے اور اقتدار کی خاطر تمام اصول و ضوابط کو نظر انداز کرنے میں سیاست دان اور آمر یکساں نظر آتے ہیں۔ اسی لیے فراز اس صورت حال سے نالاں ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ نواز شریف نے راتوں رات سازش کر کے فوجی ادارے کو اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنے کی ناکام کوشش کی۔ انہوں نے ڈی جی آئی ایس پی آر خواجہ ضیاء الدین بٹ کو چیف آف آرمی بنانے کی خفیہ سازش مکمل کرتے ہوئے ایک سپہ سالار کو فضا میں معلق رہنے یا کسی غیر کے دیس اترنے کا حکم دیا۔ ایک وزیراعظم کا فوجی ادارے کے سربراہ اور ان کے ساتھ تمام لوگوں کی عزت و وقار اور جان سے کھیلے ہوئے مسند کی خواہش کے لیے یہ قدم سلامتی اور قومی وقار کو مجروح کرنے والا قدم تھا جس کی وجہ سے فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

ہوس اقتدار اور حکومت کی خواہش سب قوانین و آئین کو پاؤں تلے روند دیتی ہے۔ اس خواہش و لالچ میں سب اندھے ہو جاتے ہیں۔ جب کسی فوجی جنرل کے چیف آف آرمی سٹاف بنانے کا مرحلہ آتا ہے تو کھلے عام سیاسی بنیادوں پر اس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے اس باوقار ادارے کی عزت پر حرف آ جاتا ہے اس کی پروانہ ملک کے وزیراعظم کو تھی اور نہ ہی اس خواہش کو دل میں بٹھائے ہوئے خواجہ ضیاء الدین بٹ کو۔ نواز شریف نے خواجہ ضیاء الدین کو سٹار کس کیفیت سے لگایا اور اس نے سپہ سالار بننے کے لیے خفیہ طور پر کس انداز میں سینے تان کر خوشی سے جھومتے ہوئے اس رینگ اور سٹار کو قبول کیا۔ اس کا ذکر خود خواجہ ضیاء الدین ڈی جی آئی ایس آئی نے ایک انٹرویو میں اس طرح کیا کہ :

”نواز شریف صدر کے پاس پہنچے، انہوں نے اس خط پر seen لکھا اور خط وزیراعظم کو واپس کر دیا جسے لیکر نواز شریف ایوان وزیراعظم پہنچ گئے۔ اس طرح مجھے حکم دیا جا رہا

تھا کہ میں پرویز مشرف کو Take-over کر لوں۔ میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔۔۔ جاوید اقبال نے اپنی وردی سے دورینک اتار کر مجھے لگائے۔۔۔ اس وقت رینکس لگانے کے لیے پن موجود نہیں تھے۔ اس لئے ماچس کی تیلی کے ذریعے رینکس نصب کیے گئے۔ میں اس وقت تک جی ایچ کیو نہیں گیا تھا اور پرویز مشرف بھی ملک کی فضاؤں میں پرواز کر رہے تھے وہ اپنی تیاری میں تھے جیسا کہ فوج کا طریقہ ہوتا ہے جب انہوں نے ٹی وی اسٹیشن پر حملہ کیا تو صاف ظاہر ہو گیا کہ اب کو کا آغاز ہو چکا ہے۔“ (۸۰)

بھٹو نے اپنی حکومت مستحکم کرنے کے لیے اور پارٹی کو فعال کرنے کے لئے حکومت میں ایسے افراد کو بھی شامل کر دیا جو سزایافتہ تھے جیسے جنرل اکبر کوراولپنڈی سازش کیس میں سزا ہوئی۔ ۱۹۵۵ میں رہا ہوئے۔ اس کے بعد پیپلز پارٹی جوائن کیا۔ اور بھٹو دور میں وزیر مملکت اور سفیر بنے۔

احمد فراز نے جس طرح آمریت کی شدت کے ساتھ مخالفت کی ہے ساتھ ہی آمریت سے فائدہ اٹھانے والوں کی بھی مخالفت کی ہے لیکن مزاحمت کارنگ تعلقات و سیاسی وابستگی کی نذر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ واضح طور پر کسی سیاسی تنظیم سے منسلک نہیں رہے لیکن پیپلز پارٹی کے ساتھ ان کی دلی اور ذہنی ہم آہنگی رہی ہے کیونکہ جب پیپلز پارٹی کی حکومت بنی تو ان کو ذوالفقار علی بھٹو نے اکادمی ادبیات کا پہلا ڈائریکٹر تعینات کر دیا لیکن جب ضیاء الحق نے حکومت کا تختہ پلٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا تو ان کو بھی برخاست کر دیا۔ یہاں سے دلی یا نظریاتی وابستگی کا آغاز نظر آتا ہے۔

لندن میں قیام کے دوران وہ بے نظیر سے ملاقات کرتے رہے۔ بھٹو نے بھی ان کو بیرون ملک میں منصب دینے کے لیے ان کو مطلع کیا تھا۔ بقول اشفاق حسین کہ ”وہ پیپلز پارٹی کی موجود روش سے خاصے آزرده تھے۔ کہنے لگے۔ یہ وہ پیپلز پارٹی نہیں جو بھٹو کی پارٹی تھی۔ پھر خود ہی بتانے لگے کہ وکلا کے احتجاجی لانگ مارچ کے اختتام پر جو جلسہ اسلام آباد میں ہوا تھا اس میں انہوں نے اس شرط پر شرکت کی تھی کہ وہاں جلسہ گاہ میں پیپلز پارٹی کے بھی جھنڈے نظر آنے چاہئیں۔“ (۸۱)

احمد فراز جلاوطن ہو کر لندن چلے گئے۔ وہاں بے نظیر سے ملاقات ہوتی رہی۔ جب بے نظیر کی حکومت آگئی تو ان کو اپنی جگہ پر نہ صرف حاضری دینے کا حکم دیا بلکہ تمام سابقہ تنخواہ اور مراعات دینے کا حکم بھی جاری کیا اس بات کو پرو فیسر فتح محمد ملک نے اس انداز میں لکھا ہے کہ ”احمد فراز نے جب پاکستان میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ

کر جلا وطنی اختیار کی تب کسے معلوم تھا کہ جمہوریت کی بحالی کے بعد وزیراعظم بے نظیر بھٹو شہید انہیں واپس وطن بلا کر اسی عہدے پر بحال کر دیں گی اور ساتھ ہی جلا وطنی کے زمانے کی ساری تنخواہ کی ادائیگی کے احکامات بھی جاری کر دیں گی۔“ (۸۲) احمد فراز نے سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے جو نظمیں لکھی ہیں اس میں سیاسی یعنی بھٹو کی مخالفت کوئی واضح انداز میں نظر نہیں آتی۔ فراز نے سیاستدانوں اور آمرؤں کے ملک لوٹنے، ملک کے سیاسی نظام کی ابتری اور عوام کی اصل صورت حال کو بیان کرتے ہوئے جامع انداز میں اپنی نظم ’کھنڈر‘ میں لکھا ہے:

یہاں سالہا سال سے قرن ہا قرن سے
وحشت انگیز اوہام سایہ فگن ہیں
یہاں بے شمار اُلؤں کے بسیرے ہیں، چگاڑوں کے ٹھکانے ہیں اور
گیڈروں نے کئی غار کھودے ہوئے ہیں
جودن کے دھند لکوں میں شب کی سیاہی میں آسیب صورت
کبھی ایک ایک اور کبھی سب مل کے یوں چیختے ہیں
کہ جیسے بنی نوع انسان کی تخریب پر نوحہ گر ہوں
(شہر سخن راستہ ہے، ص ۳۰)

اس نظم میں انہوں نے ملک کے سیاسی حالات اور سیاست دانوں کی خیانت کاری کو طنزیہ انداز میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ سید احمد ہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، جلد سوم چہارم، اردو سائنس بورڈ لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۴۴
- ۲۔ گوہر رحمانی، مولانا، اسلامی سیاست، المنار بک سنٹر لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۶
- ۳۔ کوثر نیازی، اقبال اور تیسری دنیا، غلام علی پبلشرز لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۵
- ۴۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، مابعد نوآبادیاتی مطالعہ: حدود و امتیازات، مشمولہ تخلیقی ادب نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، شمارہ ۷، ۲۰۱۰ء، ص ۲۱۹
- ۵۔ آغا سہیل، ڈاکٹر، ادب اور عصری حسیت، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰۹
- ۶۔ محمد یحییٰ خان، امریکی مکاریوں کی تاریخ، نگارشات پبلشرز لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰
- ۷۔ رضی عابدی، تیسری دنیا کا ادب، مکتبہ فکر و دانش لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۴۳
- ۸۔ قاسم یعقوب، اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۷۰
- ۹۔ اے حمید، امرتسر کی یادیں۔ مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۷۰
- ۱۰۔ محمد عباس شاہ، پاکستان کی مذہبی سیاست کہاں کھڑی ہے، www.humsub.com.pk، ۲۷ ستمبر ۲۰۱۸ء ۱۰:۰۰am
- ۱۱۔ ادارہ، مشمولہ ماہنامہ اقدار، کراچی، جلد ۳ شمارہ ۱۵، ۱۶، ۲۰۰۷ء، ص ۹، ۱۰
- ۱۲۔ شاہد نذیر چوہدری، امریکی مارشل لا، علی میاں پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۳
- ۱۳۔ عبداللہ طارق، سی آئی اے کی خفیہ جنگیں، نگارشات پبلشرز لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۰۰
- ۱۴۔ ایضاً، ص ۳۰۵
- ۱۵۔ شمیم اکرام الحق، فراز، ملامتوں اور محبتوں کے درمیان ایک شخص دل رباسا، مشمولہ: ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جلد ۱۸، شمارہ ۸۱ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۰
- ۱۶۔ احسان اکبر، فراز فن، مشمولہ: کتاب، احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۴۱، اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۲۲
- ۱۷۔ شاہد رزاقی، تاریخ جمہوریت، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۸۷، ۸۸

- ۱۸۔ قمر رئیس، پروفیسر، تعبیر و تحلیل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۸۴
- ۱۹۔ شاہد رزاقی، تاریخ جمہوریت، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۴۱۳
- ۲۰۔ قرۃ العین طاہرہ، ڈاکٹر، احمد فراز سے مکالمہ، مشمولہ: کتاب، احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۴۱، اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۲۰۰
- ۲۱۔ جاوید اختر پاشا، تعلقات عامہ۔ انقلاب آفریں، الہلال پبلشرز اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۷۲
- ۲۲۔ طارق مجید، عالمی طاغوتی کھیل میں مکرو فریب کارج، گلوبل گیم ایکسپوٹر سینٹر لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۳ء، ص ۵۹
- ۲۳۔ خورشید بیگ، میلسوئی، احمد فراز: رومانویت و مزاحمت کا شاعر، ماہ نو، احمد فراز نمبر، ادارہ مطبوعات پاکستان لاہور، شمارہ ۹، جلد ۲۱، جنوری ۲۰۰۹ء، ص ۱۴۹
- ۲۴۔ سید محمد مظفر، ڈکٹیٹر کون؟، اردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور، ۱۹۷۵ء بار دوم، ص ۴
- ۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲
- ۲۶۔ محبوب ظفر، احمد فراز شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۶ء شاعت دوم، ص ۱۲۶
- ۲۷۔ شاہد ندیم، میں نے قلم نہیں توڑا، مشمولہ احمد فراز شخصیت و فن، زیتون تاج سعید، مرتبین، احمد فراز شخصیت و فن، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ص ۳۱۱
- ۲۸۔ فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶
- ۲۹۔ سجاد حارث، ادب اور ریڈیکل جدیدیت، شرکت پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۸۸ء ص
- ۳۰۔ منیر احمد، جرنیل شاہی، زاہد بشیر پرنٹرز لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۷
- ۳۱۔ حمیرا اطہر، پاکستان کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والی مادر ملت فاطمہ جناح، مشمولہ عزم، ج ۲۲، شمارہ ۲۹، ۲۰۱۴ء تا اگست ۲۰۱۱ء، ص ۵۵
- ۳۲۔ شریف فارقی، مادر ملت سرمائے ملت، وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان اسلام آباد، اشاعت اول، ۲۰۰۳ء، ص ۲۱۸
- ۳۳۔ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۲ نومبر ۱۹۷۰ء
- ۳۴۔ عالم عباس، پاکستان میں جمہوریت پر کیا گزری، ریمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز راولپنڈی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳

- ۳۵۔ منیر احمد، جرنیل شاہی، زاہد بشیر پرنٹرز لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۹
- ۳۶۔ مسعود الحسن، پاکستان میں مارشل لاء کی حکومتیں، ادارہ کاروان ادب، لندن، ۲۰۰۱ء، ص ۲۲۲
- ۳۷۔ ایضاً، ص ۳۵
- ۳۸۔ وسیم گوہر، پاکستان ٹوٹنے کی کہانی، سارنگ پبلی کیشنز لاہور، ص ۱۳
- ۳۹۔ گوہر ایوب، ایوان صدر کے مشاہدات، سنگ میل لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲۰
- ۴۰۔ وسیم گوہر، کیا پاکستان بھٹو نے توڑا، سارنگ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۶۳
- ۴۱۔ احمد سلیم، مہاجر قومی موومنٹ تشکیل اور جدوجہد، سارنگ پبلشرز لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۶۲
- ۴۲۔ وسیم گوہر، کیا پاکستان بھٹو نے توڑا، سارنگ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۴۸
- ۴۳۔ سہیل وٹانچ، جرنیلوں کی سیاست، ساگر پبلشرز لاہور، سن، ص ۴۲۲
- ۴۴۔ ادارہ، کہاں ٹوٹی ہے زنجیریں ہماری، مشمولہ: ماہنامہ عوامی منشور، کراچی جلد ۱۲ نمبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۶
- ۴۵۔ گوہر ایوب، ایوان صدر کے مشاہدات، سنگ میل لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۶
- ۴۶۔ انور زاہدی، کرگئے کوچ کہاں کوچہ جاناں والے، مشمولہ: کتاب، احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۱، اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۴۹
- ۴۷۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۱۲ اپریل ۱۹۷۹ء
- ۴۸۔ وسعت اللہ خان، آمر برے لوگ نہیں ہوتے، www.bbc.com، ۲۳ دسمبر ۲۰۱۸، 4pm
- ۴۹۔ فاطمہ حسن، ڈاکٹر، احمد فراز کی یاد میں، مشمولہ ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جلد ۱۸، شمارہ ۸۱، اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۵
- ۵۰۔ محبوب ظفر، احمد فراز شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، اشاعت دوم، ۲۰۱۶ء، ص ۱۲۷
- ۵۱۔ زاہدہ جبین، حقیقت پسندی اور رومانویت، مشمولہ وہ جو شہر سخن تھا (احمد فراز فن و شخصیت)، گوہر پبلی کیشنز لاہور، سن، ص ۷۸
- ۵۲۔ خالد کاشمیری، جنرل ضیا کے سیاسی تضادات، عکس جہان پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۷۶
- ۵۳۔ محمد فارق قریشی، پاکستان جمہوریت کا زوال، مکتبہ فکر و دانش لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۹۵
- ۵۴۔ طاہر مغل، زندگی کے سفر میں، مطبوعات نوائے پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۸۲

- ۵۵۔ خالد کاشمیری، جنرل ضیا کے سیاسی تضادات، عکس جہان پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۷۶
- ۵۶۔ منیر احمد، جرنیل شاہی، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۰
- ۵۷۔ مسعود الحسن، پاکستان میں مارشل لاء کی حکومتیں، ادارہ کاروانِ ادب، لندن، ۲۰۰۱ء، ص ۳۴۸
- ۵۸۔ ستار طاہر، جنرل ضیا الحق ایک آدمی ایک ڈکٹیٹر، کلاسیک، لاہور، سن، ص ۱۴۲
- ۵۹۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۹ء
- ۶۰۔ مجاہد حسین، پاکستان کے متنازعہ سیاست دان، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۳
- ۶۱۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، تحسین و تردید، اثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۵۱
- ۶۲۔ شاہ محمد مری، ڈاکٹر، تیرے قلم کا سفر رائیگان نہ جائے گا، مشمولہ ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جلد ۱۸، شمارہ ۸۱، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۶
- ۶۳۔ عابد حسن منٹو، فراز مشمولہ ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جلد ۱۸، شمارہ ۸۱ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۳
- ۶۴۔ احمد سلیم، مہاجر قومی موومنٹ تشکیل اور جدوجہد، سارنگ پبلشرز لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۸۳
- ۶۵۔ مسعود الحسن، پاکستان میں مارشل لاء کی حکومتیں، ادارہ کاروانِ ادب، لندن، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰
- ۶۶۔ عادل نجمی، بحوالہ ڈاکٹر سلیم، احمد فراز، مشمولہ ماہ نو، احمد فراز نمبر، ادارہ مطبوعات پاکستان لاہور، شمارہ ۹، جلد ۲۱، جنوری ۲۰۰۹ء، ص ۶۸
- ۶۷۔ احسان اکبر، فراز فن، مشمولہ: کتاب، احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۱، اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۲۳
- ۶۸۔ شاہ محمد مری، ڈاکٹر، تیرے قلم کا سفر رائیگان نہ جائے گا، مشمولہ ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جلد ۱۸، شمارہ ۸۱، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۰
- ۶۹۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان تاریخ و سیاست، جنگ پبلشرز ۱۹۹۲ء اشاعت چہارم، ص ۲۷۹
- ۷۰۔ وکیل محمد انجم، سیاست کے فرعون، فیروز سنز لاہور، سن، ص ۱۰
- ۷۱۔ مسعود الحسن، پاکستان میں مارشل لاء کی حکومتیں، ادارہ کاروانِ ادب، لندن، ۲۰۰۱ء، ص ۲۰۰
- ۷۲۔ منیر احمد، جرنیل شاہی، زاہد بشیر پرنٹرز لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۸

- ۷۳۔ گوہر ایوب، ایوان صدر کے مشاہدات، سنگ میل لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۶
- ۷۴۔ منیر احمد، جرنیل شاہی، زاہد بشیر پرنٹرز لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۴۸
- ۷۵۔ مسعود الحسن، پاکستان میں مارشل لاء کی حکومتیں، ادارہ کاروانِ ادب، لندن، ۲۰۰۱ء، ص ۲۳۸
- ۷۶۔ گوہر ایوب، ایوان صدر کے مشاہدات، سنگ میل لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۰
- ۷۷۔ مسعود الحسن، پاکستان میں مارشل لاء کی حکومتیں، ادارہ کاروانِ ادب، لندن، ۲۰۰۱ء، ص ۳۵۴
- ۷۸۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۴ اپریل ۱۹۷۹ء
- ۷۹۔ امیر عبداللہ روکڑی، میں اور میر پاکستان، جنگ پبلشرز، سن، ص ۱۰۶
- ۸۰۔ مشتاق سرور، ڈی جی آئی ایس آئی خواجہ ضیاء الدین بٹ سے انٹرویو، مشمولہ ہفت روزہ عزم، جلد ۲۲، شمارہ ۷، ۲۸ تا ۱۳ اگست ۲۰۱۱ء، ص ۲۳
- ۸۱۔ اشفاق حسین، احمد فراز: آخری مشاعرہ آخری ملاقات، مشمولہ ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جلد ۱۸، شمارہ ۸۱، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۳
- ۸۲۔ فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳

باب سوم:

احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی سماجی جہت

احمد فراز نے اپنی شاعری میں طبقاتی نظام اور استحصالی طبقات کی سخت مخالفت اور غریبوں کی کھل کر حمایت کی ہے۔ نیز امیروں کے خیالات اور سوچ کو انسانوں کے لیے ایک زہر قاتل قرار دیا ہے۔ وہ ہمیشہ حکمرانوں اور سرمایہ داروں سے الجھتے نظر آتے ہیں۔ اسلام نے تمام انسانوں کو برابر قرار دیا ہے اور ساتھ ساتھ ممتاز و برتر ہونے کا معیار بھی بتایا ہے۔ ہم جب معاشرے کی طرف نگاہ کریں تو ان تمام اسلامی اصولوں کو نظر انداز کر کے چند سرمایہ دار عزت و احترام صرف اور صرف اپنی ذات اور خاندان تک محدود تصور کرتے نظر آتے ہیں اور دولت و طاقت کے نشے میں دوسرے کسی انسان کو اپنا ہم پلسمانے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ عزت و احترام صرف ان کی جاگیر ہے۔ دوسرے لوگ اس کے لائق ہی نہیں ہیں۔ ان کا معیار و میزان دولت و طاقت ہے اور غریبوں کو ہیچ اور اپنا غلام و خدمت گزار سمجھتے ہیں۔

اسلام نے جو تصور مساوات دیا ہے اس میں جب تفریق ہونے لگے، نسلی، لسانی اور قبائلی حیثیت و بنیاد پر دوسروں کو پست تصور کیا جانے لگے، تو اس صورت حال میں انسان کی عزت و توقیر اور حقوق کے استحصال کی ابتدا ہوتی ہے۔ معاشرہ بد امنی، بے حسی اور بے چینی کی طرف چلا جاتا ہے اور فلسفہ انسانیت دم توڑنے لگ جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ چند ثروت مند اور حکمران دولت و طاقت کے نشے میں دوسرے لوگوں کی عزت اور حقوق کا نہ صرف استحصال کرتے ہیں بلکہ انسانیت کی توہین کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ فراز کی شاعری اسی طبقاتی فرق کے خلاف احتجاج ہے۔ اس حوالے سے بابر سعید لکھتے ہیں:

"فراز کی زیادہ شاعری طبقاتی فرق کے خلاف ہے وہ ایسے لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا جو

مذہبی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان امیروں سے جو انسان کو اشیا کی طرح استعمال

کرتے ہیں۔ انسان کی آنکھوں پر سے پردے ہٹا دیتا ہے۔۔۔ کچلے ہوئے عوام کے لیے

اس کی فکر مندی حقیقت ہے اس کی شاعری اس کے دل کی آواز ہے" (۱)

حکمران اور ثروت مند طبقے اپنی برابری کے لوگوں کے ساتھ مصروف رہتے ہیں۔ انہی کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرتے ہیں اور غریبوں سے دُور رہتے ہیں۔ یہ طبقہ غریبوں کی ضرورتوں اور وسائل کی عدم فراہمی

وغیرہ سے لاعلم ہوتا ہے۔ اس کا یہی رویہ اور مزاج شاہانہ اولاد میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس طرح روز بروز معاشرہ زبوں حالی کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ اپنی دولت کی بنا پر غرور و تکبر کرنے والے لوگ عام لوگوں سے مل بیٹھے کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ سماجی و معاشرتی سطح پر بھی غریبوں سے الگ رہنے کے لیے تعلیمی، تفریحی اور تجارتی مقامات تک کو ب الگ کرتے چلے جا رہے ہیں۔

فراز اپنی شاعری کے ذریعے انسانوں کی تذلیل پر ردِ عمل کا اظہار کرتے رہے۔ نیز انہوں نے عام لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے غربت زدہ لوگوں کو اپنے مقاصد و اقتدار کے لیے استعمال کر کے ان کے حقوق سلب کرنے والوں کی مذمت کی ہے۔ فضا پر وین رانی اسی حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

"احمد فراز نے انسانیت کی توہین، تذلیل، تضحیک اور بے توقیری کرنے والے وحشیوں کو لکارتے ہوئے انہیں خبردار کیا ہے کہ ان بے بسوں پر ظلم ڈھانے سے باز رہیں جو پہلے ہی آنسوؤں سے دید و اماں تر کیے ہوئے ہیں جبر مشیت کے رات دن عہدِ زیاں میں جس طرح گزارے جاتے ہیں احمد فراز کی شاعری اُن کا نہایت درد مندانہ احوال پیش کرتی ہے۔" (۲)

حکمران اور امیر لوگوں کا غریب لوگوں کو خود سے پست اور حقیر سمجھنا، ان کے ساتھ نفرت آمیز رویہ اختیار کرنا، اور معاشرے میں عدم برداشت کا ماحول پیدا ہونا ایک بامہذب معاشرے کے زوال کی چند وجوہات ہیں۔ معاشرتی زوال کی وجوہات کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ:

"جاگیردار گھرانوں میں بچوں کی پرورش ملازموں کے ہاتھوں ہوتی تھی۔ اس لیے ماں باپ سے ان کا واسطہ کم ہی ہوتا تھا۔۔۔ بچے جیسے ہی بڑے ہوتے یہ خود کو ملازموں کے درمیان پاتے تھے جو ان کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس لیے بچوں میں ابتدا ہی سے تحکمانہ رویہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ ملازموں کو ان کی عمر یا بزرگی کا خیال کیے بغیر ان سے رعونت سے پیش آتے۔ اسی وجہ سے عام لوگوں کو شروع ہی سے تحقیر سمجھا جانے لگتا تھا اور بچوں کی نظر میں ان کی کوئی عزت نہیں دیتی تھی۔" (۳)

عدم مساوات کی ایک وجہ ہماری تہذیب و ثقافت کا زوال ہے۔ قدیم ایام میں داستان گوئی کی روایت تھی، لوگ اجتماعی صورت میں داستان سنتے تھے۔ داستان گو داستان گوئی کے درمیان چند اخلاقی اصول اور

انسانوں کی عزت و احترام کی اہمیت بیان کر کے ایک باوقار اور بامقصد زندگی گزارنے کا شعور دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے بعد والے ادوار میں بھی سربراہِ خانہ اپنی اولاد اور خاندان کے ساتھ مل بیٹھ کر بُرے اور اچھے کاموں کے نتائج بتا کر ان کی تربیت کرتے تھے۔ اپنی اولاد کو مہذب فرد بنا کر ایک مہذب معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے، اب وہ دور ختم ہو چکا ہے، جدید دور میں دنیا انتہائی محدود ہو چکی ہے۔ ہر کوئی اپنے کمرے تک محدود نظر آتا ہے۔ ہر کوئی اپنی زندگی میں مگن ہے۔ اس صورت حال اور عادت کی وجہ سے انسانوں کا احترام کرنے اور اخلاق سے پیش آنے کا رویہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ عدم برداشت کے رُجان میں شدت آتی جا رہی ہے۔

ملک میں طبقاتی نظام اور سرمایہ دارانہ راج کے خلاف قانون سازی کی ضرورت ہے۔ قانون کے نفاذ میں عدم تفریق کی ضرورت ہے لیکن سیاست دان اور سرمایہ دار اس طرح کی قانون سازی کو دلی طور پر ہرگز قبول نہیں کرتے۔ اگر قانون کی گرفت مضبوط ہو اور جرم کو جرم قرار دے کر سزائیں دی جائیں اور امیر و غریب سب کو بلا امتیاز قانونی میزان سے گزارا جائے تب جا کر معاشرے میں مساوات کی فضا قائم ہو سکتی ہے لیکن یہ حکمرانوں اور سرمایہ داروں کو ہرگز قبول نہیں کیونکہ اس سے ان کی برتری ختم ہو سکتی ہے۔ جاہ و حشم کا بھرم مٹ سکتا ہے۔

الف۔ احمد فراز کی وطن دوستی، ملک سے محبت

چمن پرست نہ ہوتے تو اے نسیم بہار

مثالِ برگِ خزاں تیری جستجو کرتے

(درد آشوب، ص ۲۲۲)

کسی گلستان کے اُجڑنے پر واویلا وہی شخص کرتا ہے جو اس گلستان سے بہت محبت کرتا ہو اور جس کے رگ و پے میں گلستان کی محبت شامل ہو۔ چمن کی محبت سے مالا مال شخص اُس چمن میں خزاں کی آمد اور اس کے آثار دیکھ کر تڑپتا ہے۔ وطن میں چلنے والی تند و تیز آندھیوں کے خلاف وہی صدا بلند کرتا ہے جو اس وطن کو اپنا مسکن و مرقد سمجھتا ہو۔

احمد فراز نے اگر سیاسی، صنفی، سماجی اور معاشی استحصال کرنے والوں کی مخالفت و مزاحمت کی ہے تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ اس گلستان کو بہت ہی چاہتے تھے۔ یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ ان کے

ہاں سیاسی، سماجی، معاشی، صنفی اور مذہبی مزاحمت میں کہیں کہیں نقص و کمی نظر آتی ہے لیکن وطن دوستی کے حوالے سے ان کے ہاں کوئی نقص و کمی نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مظلوموں کی حمایت اور ظالم باغبانوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اپنا شیوہ قرار دیا۔ ان کے وطن اور اہل وطن سے پیار کرنے کے حوالے سے ڈاکٹر طاہر تونسوی لکھتے ہیں:

"۔۔۔ وہ احمد ندیم قاسمی کے اس نظریے کا قائل ہے کہ ادیب و شاعر کو صاحب اقتدار کا نہیں بلکہ مملکت کا وفادار ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد فراز کو اپنی دھرتی ہی سے نہیں بلکہ اس میں بسنے والے ہر فرد سے پیار ہے وہ عوام کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہو کر ان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی اپنی نظموں میں کرتا ہے۔" (۴)

فراز نے ایک دفعہ انٹرویو کے دوران کہا تھا دیتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان کا نام جہاں بھی ہوگا ہم وہاں پہنچیں گے۔ اس لیے کہ پاکستان سے ہم نے رشتہ نہیں توڑا ہم اپنے عزیزوں سے رشتہ توڑ سکتے ہیں لیکن اپنے ملک سے نہیں توڑ سکتے۔ دوسری بات یہ کہ ہم جہاں بھی رہے جو کچھ بھی لکھتے ہیں وہ پاکستان کے حوالے سے ہی ہوتا ہے۔

حکمرانوں کی وجہ سے ان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہے، لیکن وہ ملک کے ہر قانون کی پاسداری کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ انہوں نے باوجود اس کے کہ وہ حکومت کی مخالفت کر رہے ہوتے تھے، ملک کی پالیسی کی مخالفت نہیں کی بلکہ احترام کیا۔ شمیم اکرام الحق نے ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ جب تمام ادیب صدام کے دور میں عراق میں تھے اور اس وقت عراق کی ایران کے ساتھ جنگ ہو رہی تھی، جب شعر اکو عراقی وردی میں بارڈر پر لے جانے کی دعوت دی تو احمد فراز نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہاں تو آپ بھی ہمارے برادر اسلامی ملک ہیں اور آپ کا مقابل بھی ہمارا برادر اسلامی ملک ہے۔ یہ بات ہماری خارجہ پالیسی کے خلاف ہے کہ میں ایران کے خلاف وردی پہن کر عراقی سرحد پر جاؤں۔

ہمارے ملک کے سیاست دان ملک کی دولت لوٹ کر بیرون ملک چلے جاتے ہیں وہاں پر اثاثے بناتے ہیں۔ دوہری شہریت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کی اولاد کی تعلیم و آسائش کا اہتمام و انتظام بھی باہر کے ملکوں میں ہوتا ہے۔ ان کے اس عمل سے ان کی وطن سے محبت اور لگاؤ کا اندازہ اس طرح سے ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنی حکمرانی کے دوران اثاثے بنانے میں مصروف رہتے ہیں اور اپنا دورِ اقتدار ختم ہوتے ہی دوسرے ملکوں کو اپنا

مسکن بناتے ہیں۔ احمد فراز اس عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے ہاں ان گروہوں کے لیے مذمت و نفرت کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ خود بھی دوسرے ملکوں میں رہے اور ان کی خود ساختہ جلا وطنی کے ابتدائی ایام انتہائی مشکل سے گزرے، پھر بھی انہوں نے وہاں سے کوئی مراعات نہیں لیں۔ اس حوالے سے فیضان عارف کا انٹرویو بہت بڑا ثبوت ہے۔ جب ان سے اس حوالے سے سوال کیا گیا کہ اس وقت پیپلز پارٹی کے لوگ دوسرے ملکوں میں سیاسی پناہ لیے ہوئے تھے اس لیے ان سے یہ کہا گیا کہ آپ بھی سیاسی پناہ لیتے ہوئے کیوں مراعات حاصل نہیں کرتے؟ اس سوال کے جواب کو فیضان عارف اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"جواب: اصل میں یہاں زیادہ تر لوگوں نے سیاسی پناہ لی ہوئی تھی، ان کو رہائش، گزارہ الاؤنس یا کام کرنے کی اجازت سمیت بہت سی سہولتیں مل جاتی ہیں، میں نے اس لیے اس اسکیم کے لیے درخواست نہیں دی کہ اس کے لیے آپ کو اپنا پاسپورٹ گروی رکھنا پڑتا ہے اور میں نے کسی قیمت پر اپنا پاسپورٹ نہیں دیا۔ میں چونکہ جذباتی سا آدمی ہوں اس لیے اپنا پاسپورٹ انہیں دینا خود کو پناہ گزین کہلوانا اور گزارے کے لیے بینیفٹ لینا اچھا نہیں لگتا۔" (۵)

فراز نے وطن کے لیے بہت سے غمے لکھے۔ ۶۵ اور ۷۱ کی جنگ کے دوران وہ مسلسل اپنے غموں اور گیتوں کے ذریعے پاک فوج کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ اہل وطن کی حب الوطنی کے ترانے سناتے ہوئے ناپاک دشمن کے خلاف قلمی جہاد جاری رکھا۔ ان کی کتاب "شب خون" وطن کے نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔

ب۔ معاشی پالیسی اور پالیسی سازوں کے خلاف مزاحمت

دریدہ پیرہنوں کا خیال کیا آتا
امیر شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

(نایافت، ص ۸۷)

کسی بھی ملک و قوم اور معاشرے کی ترقی و استحکام کی بنیاد اُس ملک کے معاشی نظام اور معاشی پالیسیوں پر ہوتی ہے اگر کسی ملک کا معاشی نظام مستحکم اور مضبوط ہو تو وہ معاشرہ اور ملک دن رات ترقی کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی ملک کی معیشت مستحکم نہ ہو تو وہ ملک نہ صرف زوال کا شکار ہوتا ہے بلکہ رفتہ رفتہ

اپنی شناخت بھی کھودیتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی وساطت سے ملک کے معاشی نظام اور پالیسی سازوں کے کردار اور کرتوتوں سے پردہ اٹھانے کی سعی کی ہے۔ کسی بھی ترقی پذیر ملک کی معیشت مستحکم ہونا یا ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ترقی یافتہ ممالک کو ہر گز ہضم نہیں ہوتا اس لیے کسی نہ کسی بہانے اور سازش کے ذریعے ترقی پذیر ملکوں پر اپنا تسلط قائم کرتے ہیں۔ ان کا یہ مکروہ طرز عمل بہت پرانا ہے۔

مغربی ممالک پہلے براہ راست اپنی عسکری طاقت کے بل بوتے پر دوسرے ملکوں کے خزانوں اور اثاثوں پر قبضہ کرتے تھے۔ ان ملکوں کے مکینوں کے منہ سے نوالے چھین لیتے تھے۔ ان ممالک کی پالیسی اب بھی یہی ہے لیکن طریقہ بدل گیا ہے۔ یہ ممالک اب براہ راست کسی دوسرے ملک کی دولت پر قبضہ نہیں کرتے بلکہ ایسے طریقے اپناتے ہیں جن کے ذریعے لاشعوری طور پر دوسرے ملکوں کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں کامیاب رہیں۔ آج بھی ترقی یافتہ ممالک تیسری دنیا کے ممالک کے سیاست دانوں، حکمرانوں اور فوجی حکمرانوں کو استعمال کرتے ہوئے ان ممالک کی دولت اور اثاثوں کو دیمک کی طرح چاٹنے میں مصروف ہیں، اسی لیے آج بھی اس غلط سوچ سے متاثرہ ممالک کے عوام کی زندگیاں اجیرن بنی ہوئی ہیں۔ غریب لوگ ایک ایک نوالے کے لیے ترس رہے ہیں۔ ثاقب رزمی بھی اسی نکتے کی طرف قلم اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جدید نوآبادیاتی نظام ایک نئے بہروپ میں آیا ہے۔ اس نے بالعموم تیسری دنیا میں اپنی

فوجیں نہیں رکھیں، بلکہ یہاں کے حکمران طبقوں کو مالی اور فوجی امداد دے کر ان کے

ملکوں کی معیشت اور سیاست دونوں پر تسلط جمالیا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا۔" (۶)

فراز نے ملکی و معاشی نظام کی ابتری کو اس ملک کی سیہ تقدیر قرار دیا ہے۔ اس پاک دھرتی کی کامل آزادی میں معاشی پہلو بھی شامل تھا لیکن یہ بھی چند سرمایہ داروں کے زیر دست چلا آ رہا ہے۔ فراز معیشت پر قبضہ کر کے غریب عوام کے حقوق سلب کرنے والوں سے ہر وقت بیزاری کا اظہار کرتے رہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ملک میں معاشی ناآسودگی کے اصل ذمہ دار سیاست دان اور پالیسی ساز افراد اور ادارے ہیں۔ وہ اس بات پر روتے رہے کہ اس ملک میں سب کچھ موجود ہونے کے باوجود روز بروز غربت اور معاشی تباہ کاریوں کا سلسلہ جاری کیوں ہے؟ ان کا یہ خیال اس لیے درست ہے کہ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے زراعت اور معدنیات کی دولت سے مالا مال کیا ہوا ہے، لیکن چند جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے اس ملک کی معیشت کی گردن پر ہمیشہ خواہش

دولت و آسائش کی تلوار رکھی ہوئی ہے۔ ملک کی عدم آسودہ صورت حال پر فراز فکر مندرہتے تھے۔ انہوں نے ملک میں بد حالی اور غربت کا تسلسل ختم نہ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

یہ کیا گلشن ہے جس گلشن میں لوگو

بہاروں کا کوئی موسم نہیں ہے

(جاناں جاناں، ص ۳۶)

کسی بھی ملک میں معاشی آسودگی انتہائی ضروری ہے۔ خصوصاً پاکستان جیسے منفعت بخش اور زرخیز ملک میں تو معاشی بحران قطعاً نہیں ہونا چاہیے۔ اس زرخیز ترین زمین سے یہاں کے سب مکین مستفید ہونا چاہئے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں حکمرانوں کی عدم توجہی، صرف اپنی ہی ضرورتوں اور آسائشوں کے لیے اسباب و وسائل کی جمع آوری اور اپنے رفیق کاروں کے مقابلے میں دولت بنانے کی دوڑ کی حالت و کیفیت کو بھی موضوع سخن بنالیا ہے۔ ملک کے اعلیٰ طبقے ہر وقت اپنا ظاہری رکھ رکھاؤ اور سٹیٹس کو برقرار رکھنے کے لیے ملکی معیشت کو تباہ کرنے کے ساتھ ملک میں موجود محنت کش مزدوروں اور غریب عوام کے حقوق سلب کرتے ہیں۔

امیر اور جاگیردار طبقے سے وابستہ افراد ہر وقت اپنا ظاہری بھرم قائم رکھنے کے لیے مختلف وسائل کی جمع آوری کے درپے ہوتے ہیں۔ اپنی سوچ کے مطابق مہنگی ترین کوٹھی، گاڑی اور ہم پلہ طبقے کے دوسرے افراد کی دیکھا دیکھی اور ان کے مقابلے میں ملازمین اور خدمت گزاروں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں لیکن ان تمام وسائل کے استعمال اور بقا کے لیے یقیناً دولت کی ضرورت ہوتی ہے، اب یہ طبقہ ملکی دولت اور لوگوں کی جمع پونجی تک کا استعمال بے دریغ طریقے سے کرتا ہے۔ ان کے اپنے اسباب و آسائش کی فراہمی کے لیے ہر طریقہ اختیار کرنے کے حوالے سے فراز نے کہا تھا کہ یہ حکمران، سیاست دان دولت کے پجاری ہیں۔ یہی لوگ اپنی اور اپنی اولاد کی سہولت کے لیے تگ و دو کرتے ہیں، لیکن ان کو غریب عوام کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ انہوں نے اس بات پر زور دے کر کہا ہے کہ عوام کو بھی ان سے اُمید رکھنا عبث ہے۔

انہوں نے "بھوکے مخلوق" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ انہوں نے اپنی اس نظم میں حقیقی آزادی اور فلسفہ آزادی کے عدم حصول کی طرف نشاندہی کی ہے۔ ظلم و ستم سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک الگ نظریاتی مملکت اور علیحدہ وطن کے قیام کے بعد بھی لوگ اس نظریاتی ملک میں غربت و افلاس کا شکار ہیں۔ یہ سرزمین خدا نخواستہ بنجر تو نہیں ہے بلکہ یہ مٹی تو زرخیز ترین اور سونا گنے والی سرزمین ہے۔ اس عظیم

ملک میں غربت و افلاس کے اصل ذمہ دار دولت پر کامل ایمان رکھنے والے چند جاگیردار ہیں۔ ان کی اس مشہور نظم "بھو کی مخلوق" کے بارے میں ڈاکٹر معصوم شرقي لکھتے ہیں:

"احمد فراز کے یہاں طنز کی لہر بہت تیز ہے۔۔۔ عوام پست حال رہے اور رہنماؤں کی جھولیاں بھرتی رہیں۔ لہذا اسی سیاسی کج روی کو احمد فراز نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔۔۔ نظم 'بھو کی مخلوق' میں آزادی پاکستان کے سات سال بعد عوام کی زبوں حالی پر شاعر کا قلم خون کے آنسو روٹا دکھائی دیتا ہے۔" (۷)

انہوں نے اپنی اس نظم میں طنز کیا ہے کہ ملک ابھی بھی معاشی بد حالی اور غربت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ الگ ریاست قائم کرنے کے باوجود ہم دست دراز ہیں اور کشکول ابھی تک ٹوٹا نہیں ہے۔ انہوں نے ملک کی معاشی ناگفتہ بہ صورت حال کا ذمہ دار جاگیردار، سرمایہ دار اور حکمران طبقوں کو ٹھہرایا ہے۔ انہی چند گھرانوں کے لوگ ملک کی معیشت پر قبضہ کر کے عیش و عشرت اور بادشاہانہ طرز کی زندگی گزار رہے ہیں جبکہ عوام آئے دن غربت کی چکی میں پستے ہوئے ایک ایک نوالے کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہیں۔ انہوں نے اس سچائی اور تلخ حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ غریب لوگ محنت و مشقت کرتے ہوئے اس دھرتی کے کھیتوں میں دن رات گزار کر فصلوں کی فراوانی کے لیے خون پسینہ ایک کرتے ہیں لیکن یہ صرف ہاری، کم اجرت اور دو وقت کی روٹی کے لیے جاگیرداروں کے غلام لوگ ہوتے ہیں۔ پتی ہوئی دھوپ میں جسم و جان تباہ کرتے ہوئے فصلوں کی نگہبانی و نگرانی کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے فصلوں کو کاٹنے کے بعد بھی یہی لوگ ایک ایک روٹی کے محتاج نظر آتے ہیں۔

ستم بالائے ستم یہ کہ سرمایہ دار غریب کسانوں کا خون چوس کر دولت اکٹھی کر کے مال بنا لیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ضرورت کی اعلیٰ چیزیں باہر ملکوں سے درآمد کر کے شاہانہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ معاشی تباہ کاری کا ایک اور سبب سرمایہ داروں کی ذخیرہ اندوزی ہے۔ ان کے گوداموں کے دروازے اُس وقت کھلتے ہیں جب ان چیزوں کی طلب میں شدت آجائے اور لوگ منہ مانگی قیمت دینے پر مجبور ہو جائیں۔ انہوں نے ان تمام تلخ حقائق و امور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:-

بیس نہ سو نہ ہزار نہ لاکھ ہیں پورے آٹھ کروڑ
اتنے انسانوں پر لیکن چند افراد کا زور

مزدور اور کسان پر جھپٹیں کالے چور
 کھیت تو سونا اُگلیں پھر بھی ہے ناپید اناج
 تیرے دیس میں سب کچھ اور تو غیروں کی محتاج
 گوداموں کے پیٹ بھرے ہیں بو جھل ہیں صندوق
 (اے بھو کی مخلوق، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۸۹)

انہوں نے یہاں اس حوالے سے طنز کیا ہے کہ اس نظریاتی ملک کو حاصل کرنے کے بعد بھی مسلمان جاگیردار، سرمایہ دار اور حکمران پھر سے عوام کا استحصال کرنے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ یہ روش فلسفہ آزادی اور مقاصد آزادی سے متصادم ہے۔ حقیقت میں ان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو فلسفہ آزادی اور مقاصد آزادی سے کوئی غرض نہیں ہوتی اگر ان کو غرض ہوتی ہے تو ان کو ملک کی دولت اور اثاثوں سے غرض ہوتی ہے۔ ان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی سوچ اور عمل کے پس منظر کو ڈاکٹر مبارک علی اس طرح بیان کرتے ہیں:

"مسلمان جاگیردار طبقہ میں خصوصیت سے اس وقت بے چینی پھیلی کہ جب کانگریس نے اس کا اعلان کر دیا کہ وہ ملک کی آزادی کے بعد جاگیر داری نظام کا خاتمہ کر دے گی۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء میں پنجاب اور سندھ کے جاگیردار مسلم لیگ میں آگئے اور پاکستان کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد کانگریس نے ۱۹۵۱ء میں ہندوستان میں جاگیر داری کا خاتمہ کر دیا، مگر پاکستان میں جاگیر داری کے نظام کو تقسیم کے بعد ایک نئی زندگی مل گئی،" (۸)

ملک میں امن و خوشحالی کی فضا قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حکمران طبقہ غریبوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھے۔ ملک کی بہتری اور ترقی کے لیے شبانہ روز محنت کرے۔ ملک کے آنے والے دنوں کو سنوارنے کے لیے اپنا آج قربان کرنے کا جذبہ رکھنا اولین شرط ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو اس معاشرے اور ملک کا صرف ایک فرد نہیں بلکہ ایک ذمہ دار فرد تصور کرنا اور انسانیت کے رشتے سے سرشار ہو کر سیاست اور حکومت کے ایوانوں میں حقیقی عوامی نمائندہ بن کر قدم رکھنا ایک لازمی امر ہوتا ہے۔ اگر یہ افراد غریبوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہو جائیں پھر کہیں جا کر معاشرے کا عام آدمی بھی سگھ کا سانس لے سکتا ہے، لیکن بد قسمتی سے ملک کو ہمیشہ سے ایماندار و مخلص نمائندے اور رہنما کم ہی نصیب ہوئے ہیں۔

ملک کے نمائندے صرف الیکشن کے دنوں میں غریب اور سادہ عوام کو رنگین خواب دکھاتے ہیں۔ ان کو جب مسند اقتدار مل جاتا ہے تو سب وعدے بھول کر اپنے اور اپنے خاندان کے لیے جائیداد وغیرہ بنانے اور آنے والے دنوں میں سیاسی راہ مضبوط کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ سیاست دانوں کے الیکشن کے دوران عوام کے ساتھ کیے جانے وعدوں اور منشور کے بارے میں افتخار عارف اس طرح لکھتے ہیں:

یہ بستی جانی پہچانی بہت ہے
یہاں وعدوں کی ارزانی بہت ہے
(جوازِ افتخار،

ص ۱۳۹)

انہوں نے اپنی ایک اور نظم "صراف" میں سرمایہ دار طبقے کی ناانصافی، غربت کے مارے ہوئے لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہوئے ان کی عزت و وقار سے کھیلنے والوں کی بھرپور مذمت کی ہے۔ انہوں نے خود اپنی اس نظم کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے اگر میں نے مشکلات کا سامنا نہ کیا ہوتا اور تنگ دستی کا زمانہ بسر نہ کیا ہوتا تو شاید میں "صراف" جیسی نظم نہ لکھ سکتا۔

انہوں نے ملک میں پائے جانے والے معاشی استحصالی رویے اور رُحان کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے اپنی دلی کیفیات و احساسات کو سپردِ قلم کیا ہے۔ انہوں نے اندھے معاشرے میں دولت کے لیے سجدہ ریز ہونے والوں کو ان کی بے رحمی کی تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اپنی نظم "صراف" میں انہوں نے اُن غریبوں کی حالت زار اور سماج میں موجود انسان دشمن سرمایہ کار عناصر کو موضوع بنایا ہے۔ ملک میں ہونے والے سنگین معاشی استحصال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس سماج میں کوئی بھی غریب شخص خون پسینہ کر کے اپنے لیے یا اپنی اولاد کے لیے دل تھام کر کوئی اچھی چیز مہنگے داموں خرید لیتا ہے لیکن اچانک اس پر کوئی بھی مجبوری آن پڑے تو اسے وہی چیز کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کرنا پڑتی ہے۔ معاشرے کا سفاک اور بے رحم سرمایہ کار طبقہ اشیاء کو کم قیمت پر لینے کے لیے مختلف حیلے، بہانے تراشتا ہے۔ یہی گروہ لوگوں کی غربت و ناداری اور مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس طرح تیار بیٹھے ہوتا ہے جس طرح شکار کرنے والے کمین گاہ میں بیٹھے موقع کی تاک میں ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار جو کہ دولت کے لیے سجدہ کرنے والے ایسے بے رحم اور سنگ دل لوگ ہوتے ہیں کہ ان

کو غریب لوگوں کی ناداری و مجبوری اور ان کے بچوں کی بھوک سے بلکنے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ان کے سامنے غریب کی سچائی اور ایمانداری اور گزارش سب بے سود ہو جاتی ہے۔

فراز کی شاعری میں ان غریبوں کا یہ دل سوز احساس و کرب بھی پایا جاتا ہے کہ غریب کو پتا اور خبر ہوتی ہے کہ غربت کتنا مشکل اور صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ وہ اس بات سے بھی آگاہ ہے کہ اس کی گراں بہا اشیا کی قیمت گرنے کی اصل وجہ اس کی غربت، مجبوری اور ضرورت مندی ہے۔ غریب آدمی جو غربت کی چکی میں پستے ہوئے درد بھرے لہجے میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ "اس معاشرے کے بے حس انسانوں کو میری غربت، مجبوری، ناداری اور شدت طلب کا احساس نہیں" غریبوں کی اس دکھ بھری شکایت کی آواز فراز کی اس نظم میں سنائی دیتی ہے۔ خون پسینہ ایک کر کے اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے والے غریب لوگ باہمت و باغیرت ہوتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو خود داری کی زندگی گزار دیتے ہیں اس کے برعکس بے ضمیر افراد کو نہ اپنی عزت و توقیر کی قدر ہے نہ دوسروں کی عزت کا لحاظ۔ معاشی استحصال و ناانصافی سرِ عام بازاروں، گلی کوچوں اور محلوں میں روز کا معمول بن چکا ہے۔ معاشی ناانصافی وغیرہ کے واقعات ہر روز دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی معاشی استحصالی اور ناانصافی کے خلاف انہوں نے یوں تحریر کیا ہے:

مجھ پہ روشن ہے کہ اس جنس گراں مایہ کو
میرے افلاس نے کم نرخ بنا رکھا ہے
دیکھ کر میری نگاہوں میں طلب کی شدت
تو نے انصاف کو نیلام چڑھا رکھا ہے
(صراف، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۲۲)

انہوں نے اس طرح کے ظلم و ستم روار کھنے والوں کو قاتل کی تلوار سے تشبیہ دی ہے۔ انہوں نے اس ناقابلِ بیان دکھ اور تکلیف کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسانیت سے عاری بے رحم معاشرے میں غریب اپنی زندگی کی جمع پونجی کو نہایت ارزاں قیمت پر اس لیے فروخت کرنے پر مجبور ہوتا ہے تاکہ اس ظالم سماج میں ان کی عزت و غیرت محفوظ رہ سکے۔ غریب آدمی کی نہایت درجہ مجبوری، بے بسی اور بے کسی میں اپنی ضرورت کی اشیا کو سرِ بازار کم نرخ پر فروخت کرنے کے ناقابلِ دید منظر کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے:

آج ایک تلخ ضرورت ہے مرے پیشِ نظر
میں کسی رنگ سے انکار نہیں کر سکتا
(صراف، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۲۳)

ملک کے معاشی استحصال اور عدم انصاف پر وہ نوحہ گر نظر آتے ہیں۔ ملک میں یہ مکروہ اور خطرناک صورتِ حال دورِ آمریت اور جمہوریت دونوں میں بلا تفریق پائی جاتی ہے۔

دورِ آمریت میں کوئی بھی سوال نہیں اٹھا سکتا لیکن اگر دورِ جمہوریت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ سیاست دانوں کو کرسی و اقتدار تک پہنچانے میں سرمایہ داروں کا بڑا کردار ہوتا ہے۔ اس لیے سیاست دان ان سرمایہ داروں کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانے سے گریز کرتے ہیں۔ غریبوں کے حقوق کی پاسداری کے لیے کوئی پالیسی یا قانون سازی کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ سیاست دانوں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے آئندہ بھی اقتدار کے خنک فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے حکومت کرنی ہے اس لیے یہ بے ضمیر سیاست دان سرمایہ داروں کے خلاف اور مظلوم و غریب عوام کے حق میں قانون سازی کرنا اپنی جاہ و حشم کھو دینے کے مترادف سمجھتے ہوئے گریزاں نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں غریبوں کے استحصال اور معاشرے میں نا انصافی سے کام لینے والوں کے خلاف آواز اٹھانے کے بارے میں بیان کرتے ہوئے عابد حسن منٹو نے کہا ہے کہ ”ایک طرف تو ریاستی جبر ہے جمہوریت اور انسانی حقوق کی پامالی ہے تو دوسری طرف استحصالی طبقات کی مسلسل بالادستی ہے۔ سماجی اور معاشی انصاف مفقود ہے۔۔۔ یہی سب کچھ فراز کی شاعری کا سیاق و سباق ہے۔“ (۹)

فراز نے ایک طرف غریبوں کی اشیاء کی ارزاق قیمت پر بکنے کی بات کی تو دوسری طرف اس سے بھی خطرناک صورت کی بھی نشاندہی کی ہے کہ معاشرے میں غریب لوگوں کی غربت و مجبوری کی بنا پر ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا رجحان غالب طور پر پایا جاتا ہے۔ ظالم سماج کے رسم و رواج کی دلدل میں پھنس کر شب و روز تلخ حالات سے گزرنے والے افراد اپنی کچھ مجبوریوں کو ختم کرنے کی خواہش لے کر قرض مانگنے نکلتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بے حس اور ظالم سماج میں انسانی حقوق کی طرف کون رکھتا ہے؟ اور سرمایہ دارانہ نظام والے ملک میں کون غریب کو قرض دیتا ہے؟ سماج میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ قرض مانگنے والا قرض دینے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے کچھ متاع گروی رکھنے کا پابند ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض غربت زدہ

افراد مجبوری کی دلدل میں اس حد تک گر جاتے ہیں کہ وہ اپنے گھر اور چھت کو بھی گروی رکھ دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں قرض دینے والا طبقہ سنگ دل اور انسانیت سے عاری طبقہ ہوتا ہے۔ وہ تو اس طرح کے مواقع کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اب تو قرض دینے اور گروی رکھنے کے ساتھ سود کی رقم روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے۔ بالآخر غریب سود کے بوجھ تلے دب جاتا ہے اور گروی رکھے گئے متاع اور گھر کو بھی نہایت کم قیمت پر قرض دینے والوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بے گھر ہو جاتا ہے۔ غریب اپنی کچھ مجبوری کو ختم کرنے کی سعی کر کے چند قدم بڑھاتا ہے مگر وہ اس نظام کے شکنجے میں آکر ناکام ہو جاتا ہے۔ اسے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس سماج اور بستی میں ایسے سفاک لوگ اس طرح کے لوگوں کا شکار کرتے، ہر قدم پر دھوکہ دیتے اور مکر و فریب کے جال بچھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

فراز نے ظالم سماج اور معاشرے میں پیش آنے والی استحصالی صورت حال اور ظلم کی جڑوں کو کُرید کُرید کر ان کی نشاندہی کرتے ہوئے مردہ ضمیر لوگوں کو احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ ملک میں سرمایہ دار طبقہ راتوں رات بے تحاشہ دولت کا مالک بنتا چلا جا رہا ہے اور غریب غریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے اس ناہمواری اور ظلم و زیادتی کی زد میں آنے والے مفلوک الحال غریبوں کی حالت زندگی اور غربت کی چکی میں پستے ہوئے بے گھر ہونے والوں کے المیے کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

کتنے مجبوروں نے بڑھتی ہوئی حاجت کے لیے
کیسے حالات میں کس نرخ یہاں بیچ دیے
کتنے ناداروں نے افلاس کے چکراؤ میں
پہلے تو رہن کیے، بعد ازاں بیچ دیے

(صراف، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۲۲)

استحصالی عناصر حکمران اور سرمایہ دار طبقے ہیں اور معاشرے میں غیر انسانی سلوک، فتنہ و فساد انہی لوگوں کی وجہ سے عام ہوتا جا رہا ہے۔ ان کی عدم انسانیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اور ان کی اولاد مغربی ممالک میں تمام آسائشوں اور سہولیات کے ساتھ تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آکر معیشت و حکومت پر قبضہ جمالیتے ہیں۔ مغرب کی فضا میں پُر تعیش زندگی گزارتے ہوئے تعلیم حاصل کرنے والوں کو نہ غربت و افلاس کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی غریبوں کی تلخ و تاریک زندگیوں کی طرف ان کی نگاہیں جاتی ہیں۔ امیر زادے بھی اُن

ممالک کی پالیسی اور اصولوں کو اپناتے ہوئے دولت کی لالچ اور حرص میں لوگوں کے منہ سے ایک ایک نوالہ چھیننے کی پالیسی مرتب کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ پالیسی تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے متعلق ترقی یافتہ ممالک کی مرتب کردہ اور آزمائی ہوئی پالیسی ہے۔

معاشرے اور سماج میں خوشی و غم کا دن سب کے ہاں مشترک ہوتا ہے۔ اسی طرح مذہبی تہوار، تہذیب و ثقافت کے ایام بھی امیر و غریب سب کے لیے مشترک ہوتے ہیں لیکن دولت و غربت کے سبب ان ایام میں بھی افتراق کی ایک رسم وجود میں آگئی ہے اور یہ رسم روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ افزائے اپنی شاعری میں ہمارے سماج میں پائے جانے والے اس نشیب و فراز اور اختلاف کو نہایت باریک بینی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مذہبی تہوار اور تہذیب و ثقافت کے ایام سب کے لیے یکساں ہوتے ہوئے بھی ہم ان ایام میں امیر و غریب کے درمیان تفاوت و اختلاف کا مشاہدہ واضح طور کر سکتے ہیں۔ اسی موضوع پر اردو ادب کے پرانے لکھاری یعنی شعرا وادبا بھی قلم اٹھاتے نظر آئے ہیں جیسے پریم چند کا مشہور افسانہ "عید گاہ" قابل ذکر ہے۔ یہ افسانہ معاشرے کی اسی تفریق پر مشتمل مضبوط تحریر ہے۔ اس میں انہوں نے عید کے موقع پر غریب اور امیر لوگوں اور ان کے بچوں کے طرز زندگی کو نہایت باریک بینی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فراز نے بھی "ہلال عید" کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر اس مذہبی تہوار کے دن پیدا ہونے والے دل سوز حالات کا ذکر کیا ہے۔ اب تو یہ دن صرف ثروت مندوں اور ان کے متعلقین کے لیے اظہارِ خوشی اور اسبابِ خوشی کی فراوانی کا دن ہوتا ہے، یہ دن باوجود مشترک دن ہونے کے مفلوک الحال لوگ اذیت ناک طریقے سے گزار دیتے ہیں۔ اس دن انسانی حقوق سے صرف نظر کرتے ہوئے اسلامی معاشرے میں ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہونے کی روایت کا جنازہ نکلتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔

اس تہوار پر ابھی بھی ہم معاشرے میں ایسے حالات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ شہنشاہانہ زندگی گزارنے والے اپنے ہم مرتبہ لوگوں کو خصوصی دعوت دے کر اپنے گھر، بنگلے اور محلات کے دروازے وا کر کے مختلف انواع و اقسام کے کھانوں کا اہتمام و انتظام کرتے ہیں یہ لوگ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے زرق برق لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں، لیکن دوسری طرف غربت و افلاس اور بے مائیگی حیات کی وجہ سے اُداس اور مرجھائے ہوئے لوگوں کا خیال کرنے کے بجائے ان سیاہ تقدیر اور زمانے کے مارے ہوئے لوگوں کو پہلے ان کی گلیوں سے

گزرنے سے منع کیا جاتا ہے پھر ناداری کے بوجھ تلے دب کر جبرِ مسلسل کی طرح زندگی کاٹنے والوں پر ان کو چوں سے گزرنے پر بھی پابندی لگائی جاتی ہے۔ احمد فراز نے ایسے بے توقیر معاشرے کے خلاف کڑی تنقید کی ہے۔

ایک مقام پر انہوں نے عید کے دن کا منظر دکھا کر ایسے بے حس اور غیر انسانی معاشرے کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ یہ منظر قیامت خیز اور رقت آمیز منظر ہے۔ جہاں آسودہ حال لوگ نا آسودہ لوگوں کی مدد کرنے، ان کے زخموں کو مندمل کرنے کے لیے مرہم رکھنے کے بجائے نمک پاشی کرتے نظر آ رہے ہیں۔ انہوں نے اس منظر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

کہیں تو جسم بہ ریشم کے ڈھیر بارِ نظر
کہیں بدن پہ ہیں عریانیاں ہی پیراہن
(ہلال عید، شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۱۶۹)

عید تو بلا امتیاز ہر کسی کے لیے خوشی لے کر آتی ہے لیکن اہل ثروت اور ان کے بچوں کے لیے یہ خوشی و سرور کا دن ہوتا ہے جبکہ غریب و تہی دست والدین کے لیے یہ نہایت صبر آزمادہ دن ہوتا ہے۔ بچے اپنی خواہش پوری نہ ہونے پر اور والدین اپنی اولاد کے اسبابِ خوشی کی عدم فراہمی اور اپنی بے بسی پر خون کے آنسو بہا رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں اس دن کو غریب طبقوں کے لیے اذیت ناک قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

کہاں وہ دن کہ غریب الدیار روتے تھے
یہ حال ہو تو وطن میں ستم ہے عیدِ وطن
(ہلال عید، شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۱۶۸)

معاشرہ اس نہج تک آپہنچ چکا ہے کہ لوگوں کو دو وقت کی روٹی بڑی مشکل سے میسر ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں والدین خطرناک ذہنی اذیت سے اس طرح گزر رہے ہوتے ہیں کہ وہ مزید اپنے لیے ہر گز نہیں جینا چاہتے وہ تو صرف اور صرف اپنی اولاد کے لیے جیتے اور مشقت کرتے پھرتے ہیں۔ غریب طبقوں میں مرد و خواتین یہاں تک کہ ان کے قریب الموت افراد بھی اپنے خاندان کی بھوک مٹانے کے لیے ہاتھوں پر چھالے پڑے ہوئے معمولی اجرت پر کام کر رہے ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ والدین ناداری اور بے بسی میں، اپنے بچوں کو بھوک کی شدت سے تڑپتے دیکھ کر اپنے اعضا بھی فروخت کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک نظم میں

غریب لوگوں کے اس المیے کی کہانی سنائی ہے۔ ان کی یہ نظم بھی غربت کے ستائے ہوئے بد نصیب و بد قسمت لوگوں کے بارے میں ہے۔ ان کی اس نظم کے موضوع اور حساسیت کے بارے میں داکٹر معصوم شرقی لکھتے ہیں:

”۔۔۔ نظم خون فروش میں بھی عوام کی مفلوک الحال کی خوبصورت انداز میں موضوع

بنایا گیا ہے۔۔۔ ایک غریب آدمی نہ جانے کس درجے کا مجبور ہوتا ہے تب وہ اسپتال جا

کر اپنا خون بیچتا ہے۔ نظم پڑھنے سے رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“ (۱۰)

انتہائی غربت کے عالم میں انسان اپنے اعضا و خون تک بیچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے معاشرے کا المیہ ہے جہاں صاحبِ دولت کی بالادستی ہوتی ہے۔ غریب والدین اپنے بچوں کی فرمائش پوری کرنا تو دور کی بات ان میں زندگی کی رفق برقرار رکھنے کے لیے خوراک مہیا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ حالات سے لڑتے لڑتے نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنا خون ہی کیا اپنے اعضا بھی بیچ رہے ہوتے ہیں۔ یہ سماج دشمن اور انسان دشمن عناصر ظاہری مسیحاؤں کی صف میں بیٹھ کر حقیقت میں قصائیوں کا کام کرتے ہیں۔ اور غریب لوگوں کے اعضا نکال کر ان ناداروں کو چند سکے تھما کر خود لاکھوں روپے کما رہے ہوتے ہیں۔ یہ کام ایک باقاعدہ اور منظم کاروبار کی صورت اختیار کر چکا ہے لیکن حکومتی سطح پر کچھ اقدامات اور ایکشن لینے سے اس دھندے میں ملوث مافیا کی وجہ سے پیش آنے والے دل خراش واقعات میں ابھی کمی آگئی ہے۔

غریب والدین غربت سے تنگ آکر اپنے پھولوں کے ساتھ موت کو گلے لگا کر ہمیشہ کے لیے اس انسان دشمن معاشرے سے راہِ فرار اختیار کر رہے ہیں۔ غریب اپنے بچوں کے لیے تگ و دو کرنے کے لیے صبح گھر سے نکلنے کے باوجود شام کو خالی ہاتھ لوٹ کر گھر کی حالتِ زار دیکھتے ہوئے اپنے اعضا و خون کو بیچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ کوئی اس کی مدد نہیں کرتا۔ انہوں نے اپنی اس نظم میں دل خراش حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے:

”مگر شام کو بے ثمر لوٹتا ہے

اُسی گھر میں

جس میں مرے خون کے لو تھڑی

جرعہ شیر اور پارہ نان کی آرزو میں

مراراستہ دیکھتے ہیں

--

خدایا

میں کیسے بتاؤں انہیں

خون فروشی ضرورت ہے میری

تجارت نہیں ہے

(خون فروش، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۰۳۰)

ج۔ انسانی رویوں کے خلاف مزاحمت

بہت سے ہمنوا یان چمن نے

نظر دانے پر رکھی دام پہ ننیں

(پس اندازِ موسم، ص ۱۳۷)

معاشرے کے عوام کی بے حسی کے علاوہ اہل قلم و اہل دانش کی اکثریت بھی اپنے فرائض اور احساسِ ذمہ داری سے دُور ہو کر مصلحت پسندی کا شکار ہوتے ہوئے نظر آتی ہے۔ احمد فراز نے اپنے قبیلے کی اکثریت کی مصلحت پسندی اور قلمی خیانت کے خلاف بھی آواز اٹھائی ہے۔ فراز نے اپنے معاشرے میں بسنے والے اور ہر روز مختلف سانحات کو قریب سے دیکھ کر چشم پوشی کرنے والے فنکاروں کی شدید مخالفت کی ہے۔ انہوں نے قلم کاروں کو بھی دعوت فکر دیتے ہوئے مصلحت و مراعات کی خاطر قلم کے استعمال کو ترک کرنے کی تاکید کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کسی حاکم کے حکم سے مرعوب ہو کر یا مراعات کے حصول کے لیے قلم و قرطاس سے وابستہ ہونا خیانت، غیر معقول اور جزوقتی عمل ہوتا ہے۔ امیر وقت کی حمایت و توصیف کے لیے قلم کو حرکت دینے والوں کی عزت و مراعات ہر گام و ہر لحظہ متزلزل ہوتی ہے۔ حاکم دوراں اپنے مقاصد کی تکمیل کے ساتھ ہی یا تو سب کچھ بھول جاتا ہے یا نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ اہل قلم کسی سے مرعوب ہوئے بغیر اور مصلحت سے بالاتر ہو کر اپنی ذمہ داری نبھانے کی کوشش کریں۔ اہل قلم و اہل دانش بھی اگر شعور و آگہی دینے سے گریز کریں تو باطل کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ شمینہ راجا بھی اسی نکتے پر بحث کرتی ہوئی لکھتی ہیں کہ:

"اگر اہل علم اہل اقتدار سے مرعوب ہو جائیں گے اور مراعات و انعامات کے حصول کے لیے قطار میں لگ جائیں گے تو کون کلمہ حق بلند کرے گا۔" (۱۱)

انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ آج اگر میں ظالم و جابر کے خلاف کھڑا ہوں لیکن کچھ لوگ اُن سے تعلق قائم رکھ کر مراعات لے رہے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مجھے وقتی طور پر مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جبکہ مصلحت پسندوں کو مراعات مل رہی ہیں۔ فراز نے حصول مراعات و انعامات کی خاطر اندھے ہو کر ملک میں چلنے والی تند و تیز آندھیوں کی حمایت اور حق میں بات کرنے والوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اس غیر مستحسن عمل کو ترک کریں، یہ آندھیاں سب چراغوں کو گل کر دیتی ہیں صرف تقدیم و تاخیر کی بات ہے۔ وہ اہل قلم سے اس طرح گویا ہوئے تھے:

میں آج زد پہ ہوں تو خوش گمان نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۰۱۳)

انہوں نے اپنے قبیلے کے قلم فروشوں اور گداگرانِ سخن کے خلاف کھل کر بات کی ہے۔ فراز بولنے کے وقت خاموش رہنے والوں، سچ بات لکھنے کی ہمت و حوصلہ نہ رکھنے والوں اور ظالم و حاکم وقت کے ظلم و جبر کو خیر سے عبارت کرنے والوں سے ہمیشہ اختلاف کرتے رہے۔ معاشرے کو ہر اچھائی اور برائی سے آگاہ کرنا اور ان کی حقیقت بتانا قلم کاروں کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن بعض قلم کار مصلحت پسندی کا شکار ہو کر اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے، اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ:

یہ عہد سنگ زنی ہے سوچپ ہیں آئینہ گر
کہ لب کشا ہوں تو سمجھو دکان جاتی ہے
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۷۷۵)

اگر ہر قلم کار خواہ شاعر ہو مضمون نگار ہو، کالم نگار ہو یا صحافی وغیرہ، مصلحت و مراعات سے بالاتر ہو کر معاشرہ سازی کے لیے جدوجہد کرے تو کچھ مدت بعد ایک مثالی معاشرہ قائم ہونے کا امکان ہے اور ایسے معاشرے کے قیام سے رعیت و عوام خوش ہوتے جبکہ خائن و ظالم افراد کے قدم لرزتے ہیں، اور مقتدر ایوانوں کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔ ایسے فضا قائم ہونے سے حکمرانوں کی نیندیں بھی حرام ہو جاتی ہیں۔ مثالی اور باوقار

معاشرہ سازی کرنے کی صلاحیت رکھنے اور کوشش کرنے والوں کو حکمران کبھی بھی اتفاق و اتحاد سے یکجا ہونے نہیں دیتے۔ ایسی پالیسی وضع کر لیتے ہیں کہ قلم کار گروہ در گروہ تقسیم ہو کر اس نہج تک آجاتے ہیں کہ ہر کوئی حاکم دوراں سے قربت حاصل کر کے نوازشات و مراعات حاصل کرنے کے لیے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکمران نہایت ارزاں قیمت پر ان کے ضمیر کو خرید لیتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے ان قلم فروش اور ضمیر فروشوں کے بارے میں لکھا ہے:

بکنے والوں میں جہاں ایک سے ایک آگے ہو

ایسے میلے میں خریدار کو کیا بولنا ہے

(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۷۸)

احمد فراز ہر وقت قلم کی طاقت پر یقین رکھتے تھے۔ اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ انہوں نے روپے اور عزت کی خاطر کبھی بھی قلم کو جنبش نہیں دی۔ وہ ظالم کی تلوار سے زیادہ قلم کی طاقت پر کامل یقین رکھتے ہوئے یہ خیال کرتے تھے کہ اگر قلم پوری طاقت و حقیقت سمیت جنبش کرے تو ایسی کیفیت میں طاغوت کو بے بس کر کے اور ان کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر سکتا ہے۔ انہوں نے شمشیر اور قلم کی طاقت کا مقابلہ کرتے ہوئے قلم کی طاقت کو یوں بیان کیا ہے:

اُسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بہت

اُسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

(محاصرہ، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۹۱۶)

صعوبتوں کے باوجود وہ آمریت سے برسرِ پیکار رہے اور بانگِ دہل صدائے احتجاج بلند کرتے رہے۔ وہ اس نبرد آزما کیفیت میں قلم کی فتح و کامرانی پر یقین رکھتے ہوئے اپنے جذبات کو ان الفاظ میں پروتے ہیں۔

تمام عمر کی ایذا نصیبوں کی قسم

میرے قلم کا سفر رائیگان نہ جائے گا

(محاصرہ، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۹۱۸)

ان کے ہاں پائے جانے والا تصورِ حرمتِ قلم اور احترامِ انسانیت کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے

ہیں:

"قلم کی ناموس اور انسان کی حرمت کا تحفظ ہی احمد فراز کی شاعری کا دستور العمل رہا ہے۔" (۱۲)

اہل قلم و اہل دانش ملک و معاشرے کے دیدہ ور لوگ ہوتے ہیں۔ چشم بینا رکھتے ہوئے اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنا اور تعفن زدہ سوسائٹی میں عطر فروشی کا کام کرنا ان کا اہم ترین مقصد اور ذمہ داری ہے، لیکن تاریخ کا مطالعہ کرنے پر چند ایسے نام ملتے ہیں جو چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے داستانِ ظلم سنانے سے احتیاط برتتے ہوئے پُر فتن دور اور اس کی کہانی سنانے سے احتراز کرتے نظر آتے ہیں ان افراد کی بے بسی اور بے ضمیری پر طنز کرتے ہوئے انہوں نے یوں تحریر کیا ہے۔

اِس دور بے جنوں کی کہانی کو لکھو
جسموں کو برف خون کو پانی کو لکھو
کوئی کہو کہ ہاتھ قلم کس طرح ہوئے
کیوں رُک گئی قلم کی روانی کوئی لکھو
کیوں سُر مہ در گلو ہے ہر اک طائر سخن
کیوں گلستانِ قفس کا ہے ثانی کوئی لکھو
(جاناں جاناں، ص ۸۸)

ان کی شاعری میں انہوں نے ایسے ادیبوں کی سخت مخالفت کی ہے اور اپنے قبیلے کے ان افراد سے نالاں نظر آتے ہیں جو مصلحت پسندی کی وجہ سے حقائق سے چشم پوشی کرتے رہے۔ ایسے لوگوں کی مخالفت کرنے کے بارے میں مسعود مفتی لکھتے ہیں:

"تیسری سطح پر فراز کا احتجاج اپنی برادری کے خلاف ہے، ادیبوں کی مصلحت کوشی کے خلاف، اُن رنگین نوا شاعروں کی چشم پوشی کے خلاف جنہیں اقبال نے "دیدہ بینائے قوم" کا مرتبہ دیا تھا۔ قلم کی آڑ میں زمینی حقائق فراموش کرنے والوں کے خلاف، زندگی کی عکاسی کرنے والوں کا زندگی سے فرار کے خلاف۔" (۱۳)

ادب معاشرے کی کمی و بیشی کا عکاس ہوتا ہے۔ ہر ظالم معاشرے میں معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کرنے والوں پر سختیاں ہوتی چلی آرہی ہیں، بعض فنکار ظالموں اور ستم گروں سے مرعوب اور خائف ہوئے بغیر

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی مخالفت کرتے ہوئے تختہ دار تک جا پہنچے، لیکن اس کے برعکس بعض حالات میں چند فنکاروں نے حقائق سے چشم پوشی تو نہیں کی بلکہ معاشرے کی ناآسودگی، حقوق کی عدم دستیابی، عدم مساوات اور ناانصافیوں کے بارے میں کھل کر اظہار کرنے اور ان طاقتوں کے خلاف آواز بلند کرنے میں احتیاط کی راہ اپنائی۔ یہ ادیب مختلف موضوعات پر اشاروں اور کنایوں کی زبان میں لکھتے رہے۔ انہوں نے علامتی انداز کو اپنا کر لکھنے کی کوشش کیں۔ قلم کاروں کے اس گروہ نے علامت نگاری کی راہ کا انتخاب کیا۔ یہ فنکار اپنا پیغام خیر خواہی کے ساتھ دینا چاہتے تھے لیکن فراز بات کو لگی لپٹی انداز میں کہنے کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے وہ ہر وقت کھل کر بات کرتے رہے۔ ان کو اپنی اس روش پر ناز تھا اسی لیے انہوں نے کئی جگہوں پر مخالفین کے ہوتے ہوئے بھی کھل کر بات کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ بقول ناصر زیدی کے:

"احمد فراز ہر دور کے شاعر ہیں ہر عہد کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اُس وقت بھی بڑی جاندار شاعری کی جب بہت سے شاعر مصلحتوں کے سبب خاموش رہے یا فرضی ناموں سے لکھتے رہے یا شاعری میں ایسی علامتوں کا سہارا لیتے رہے، جو جابر سلطان کے کیا کسی کے بھی پلہ نہ پڑ سکیں۔ احمد فراز انتہائی جبر کے طویل دور میں بھی لب کشا رہے اور عام لوگوں کے دلوں کی آواز بنے رہے۔" (۱۷)

سخت اور کھٹن حالات میں احتیاط کا راستہ انتخاب کرنے والے فراز کو بھی نازک اور سخت حالات میں احتیاط برتنے کا مشورہ دیتے رہے۔ ان فنکاروں کی سوچ یہ تھی کہ اگر قلم کو احتیاط سے حرکت نہ دی جائے تو سزائیں مل سکتی ہیں یہاں تک کہ روزگار اور جان تک کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ انہوں نے آمروں اور حکمرانوں کی نظروں سے بچے رہنے کے مشورے پر عمل کرنے سے انکار کیا۔ ان کے مشورے کو وہ ان اشعار میں بیاں کرتے ہیں:

ہم سے کہیں کچھ دوست ہمارے مت لکھو
جان اگر پیاری ہے پیارے مت کھو
حاکم کی تلوار مقدس ہوتی ہے
حاکم کی تلوار کے بارے مت لکھو
(بے آواز گلی کو چوں میں، ص ۱۸)

وہ ہر وقت ان کی مخالفت کرتے تھے جو منافقت سے کام لیتے تھے اور حاکموں سے امیدیں وابستہ کرتے تھے۔ اسی نکتے ک طرف اشارہ کرتے ہوئے طاہر محمد خان لکھتے ہیں "

"اپنے عہد کی منافقت اور ریاکاری کو فراز نے جگہ جگہ بے نقاب کیا ہے۔ تلخ و ترش انداز سے کبھی رمز و کنایہ میں۔ اسے افسوس ہے کہ ہمارے دانشوروں نے کبھی جمہوریت کا ساتھ نہیں دیا انہوں نے گرتے ہوؤں کو سہارا نہیں دیا۔۔۔ کیونکہ وہ شاعر، ادیب اور دانشور کو قوم کا امیں سمجھتا ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ امین امانت داری نہیں کر رہا ہے تو وہ قدرے درشتی سے اپنی بات کہتا ہے" (۱۵)

انہوں نے ان کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کی نظریہ یہ تھا کہ سچ اور حق کی بات کرنے میں کسی تامل، فکر اور اندیشے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ بلکہ حق کی آواز بلند کرنا زندہ ضمیری کی علامت ہے وہ اپنے موقف کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

دل کہتا ہے کھل کر سچی بات کہو
اور لفظوں کے بیچ ستارے مت لکھو
(بے آواز گلی کوچوں میں، ص ۱۹)

انہوں نے منافقت کا روپ اختیار کرنے والوں کے ظاہر و باطن کے ایک نہ ہونے پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے۔

سُنا ہے ایک طائفہ ہے اہل دل کا
جو دیوانہ نہیں دیوانہ پن پہنے ہوئے ہے
(پس اندازِ موسم، ص ۴۶)

وہ متاعِ درد سے عاری افراد اور مشکل اور کٹھن حالات میں گوشہ عافیت میں رہتے ہوئے حالات سازگار ہونے کا انتظار کرنے والوں سے بہت نالاں تھے۔ وہ ایسے فنکاروں کے اس کرتب پر حیران تھے جو ضرورت و مشکل حالات میں چپ رہتے اور حالات بہتر ہوتے ہی ایسے نعرے لگاتے اور صدا بلند کرتے گویا ان سے بڑھ کر وطن پر مر مٹنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ جس وقت ملک و قوم تلخ اور موہوم دور سے گزر رہی ہوتی تھی اُس وقت یہ لوگ سکوت کی دنیا آباد رکھے ہوئے ہوتے، جب وقت و حالات بدل جاتے تو ان کی آواز میں

شدّت آجاتی اور یہ لوگ متحرک نظر آتے تھے۔ ایسے خصائل و اوصاف رکھنے والوں پر طنز کرتے ہوئے فراز کہتے ہیں۔

ستم تو یہ ہے کہ عہدِ ستم کے جاتے ہی
تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۵۲۸)

اس شعر کی وضاحت مسعود مفتی کی تحریر سے ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"جنرل مشرف کی آہنی گرفت ڈھیلی ہونے لگی تو میدان، سڑکیں اور گلی کو چے پیچتے
چنگاڑتے عوام سے چھلکنے لگے۔ تب باہمی طور ستیزہ کار ادیبوں کے چھوٹے چھوٹے
گروپ کبھی کبھار ایک آدھ احتجاج چیخ کی طرف تھوڑی دیر کے لیے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد
بنا ڈالتے اور احمد فراز کو بطور امام مدعو کر لیتے۔" (۱۶)

اہل قلم کی صف اور گروہ میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جو ظلم و استیصال اور جبر کرنے والوں کے
خلاف آواز اٹھانے کے بجائے ان کی مدح و توصیف لکھ کر سینہ قرطاس کو چاک کرتے چلے آ رہے ہیں۔ حق و
باطل کا پیمانہ معرکہ کربلا ہے۔ حسینؑ اور یزید حق و باطل کی پہچان ہے۔ وہ اہل قلم جو مقتدر قوتوں کی قصیدہ
خوانی کرتے ہوئے ان کی محبت میں اتنے اندھے ہوتے ہیں کہ ان قوتوں کی خامیوں کو بھی کارناموں سے تعبیر
کرتے ہیں۔ فراز ان سے ہمیشہ اختلاف کرتے رہے۔ اپنی عزت و توقیر سے نا آشنا ہو کر حرمت قلم کو پامال کرتے
ہوئے چند سکوں کی خاطر سچ اور حق کی بالادستی کو گزند پہنچانے، سچ کو زیر دست کرنے کا مکروہ عمل انجام دینے
والوں کے خلاف انہوں نے ترش لہجے میں بات کی ہے۔

اور اب جو ہے کربلا کا نقشہ
تم مدح یزید گا رہے ہو
جب سچ تہہ تیغ ہو رہا تھا
تم سچ سے نظر پُرا رہے ہو
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۱۰۹)

د۔ عام لوگوں کی خاموشی اور رویے کے خلاف مزاحمت

نابینا لوگوں کے ملک کا مالک و حکمران بننے اور اندھوں کی حکمرانی میں عوام کی لاشعوری خاموشی کا فرما ہوتی ہے۔ مشہور قول ہے "جیسی عوام ویسے حکمران۔" کسی بھی ملک اور کسی بھی جگہ کی اصل طاقت و قوت عوامی طاقت و قوت ہوتی ہے۔ عوام اگر باشعور ہو کر جرأت کا مظاہرہ کرے تو بہت جلد غلط نظام کی کاپیٹ کر تبدیلی لاسکتے ہیں۔ جابر سے جابر حکمرانوں کو نکیل ڈال سکتے ہیں۔ عوام نا سنجھی، جہالت اور مختلف مکرو فریب کا شکار ہو کر نسلی، لسانی اور مذہبی تعصب کے دلدل میں پھنس کر اپنی قوت و طاقت کھو بیٹھتی ہے۔ عوام پہلے سے ظلم سہتے ہوئے ہر حکمران طبقے کی باتوں اور پالیسیوں کو من و عن تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ کوئی بھی ظلم و ظالم کے خلاف متحد ہو کر آواز بلند نہیں کرتا، اس لیے عوام پر ہونے والے مظالم پر عوام کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ فراز جس طرح اہل قلم یعنی اپنے قبیلے کی مخالفت کرتے رہے اسی طرح عوام کی بھی مجرمانہ خاموشی سے شکی رہے۔ وہ ہر وقت عوام کو جرأتِ اظہار کی طرف اکساتے رہے۔

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہد ستم کی

اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

(جاناں جاناں، ص ۲۲)

ہوس حکمرانی اور خواہشِ اقتدار کے تعاقب میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اگر عوام کی سُست روی، خائف ہونے اور زیرِ عتاب آنے کا شائبہ بھی ہو جائے تو وہ عوام کو کبھی لوریاں سُنا کر خواب غفلت میں دھکیل دیتے ہیں تو کبھی طاقت کے بل بوتے پر غلامی کا طوق ان کی گردن میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فراز عوام کے ڈر اور خوف کی حالت اور ان کے سہمے ہوئے زندگی گزارنے کو ناپسندیدہ فعل سمجھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہر شہری ہر ملک کا باسی با مقصد اور آزادی کے ساتھ زندگی گزارے۔ انہوں نے بے مقصد غلامانہ زندگی گزارنے والے انسانوں کو چلتی پھرتی لاش سے تعبیر کیا ہے۔

اے جل سے خوف زدہ زیست سے ڈرے ہوئے لوگ

سو جی رہے ہیں مرے شہر میں مرے ہوئے لوگ

(اے عشق جنوں پیشہ، ص ۱۸۰)

یہ دور پُر آشوب دور ہے۔ ہر ایک کو اپنی ذات کی فکر ہے دوسروں کی کوئی فکر نہیں۔ اس دور کے انسان اپنے قرب و جوار میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات اور اس کی وجوہات سے لاعلم ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ اپنی شاعری کی وساطت سے لوگوں کو اس رویے کو ترک کرنے، نفسا نفسی کے بتوں کو پاش پاش کرنے اور انسانیت کے رشتے سے سرشار ہو کر دوسروں کو بھی جینے کے اسباب و وسائل فراہم کرنے کی بات کرتے تھے۔ وہ شاعری کے ذریعے معاشرے میں موجود لوگوں کے دکھ درد اور اپنا دکھ درد سمجھنے کا پیغام دیتے رہے۔ انہوں نے بے حس معاشرے کے بے حس مکینوں کو جھنجھوڑتے ہوئے یوں کہا ہے۔

اپنے ہی لیے بہانہ دریا
اوروں کے لیے بھی آنکھ نم کر

(نایافت، ص ۹۳)

انسان اپنی زندگی گزارنے کے لیے دوسرے لوگوں کا محتاج ہوتا ہے، کسی بھی سماج و معاشرے میں بسنے والا کوئی بھی شخص پھول کی مانند ہوتا ہے۔ اگرچہ رنگ و بو میں اختلاف پایا جاسکتا ہے لیکن سب اسی چمن کا حصہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے اشعار کے ذریعے یہ شعور دینے کی کوشش کی ہے کہ آپس میں مل بیٹھ کر رہیں کیوں کہ سب کا نفع اور نقصان ایک ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی فرمایا تھا:

منفعت ایک ہے اس قوم کا نقصان بھی ایک
حرم پاک بھی قرآن بھی ایمان بھی ایک

(جواب شکوہ، کلیات اقبال، ص ۲۳۰)

اگر گلستان میں کسی آفت یا آزمائش کی نوبت آجاتی ہے تو سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی چمن میں خزاں آتے ہی بلا اختصاص سب پھولوں کے پتے گرتے ہیں۔ انہوں نے معاشرے اور سماج میں رہنے والوں کے آپس کے رشتے کو مضبوط کرنے پر زور دیا اور اگر اتحاد و اتفاق کو نظر انداز کریں تو مکافاتِ عمل اور اس نا اتفاقی کے نتائج کو عوام کے سامنے رکھتے ہوئے کہا ہے کہ نفع و نقصان میں سب شریک ہوں گے۔

یہ مملکت تو سبھی کی ہے خواب سب کا ہے
یہاں یہ قافلہ رنگ و بو اگر ٹھہرے
تو حسنِ خیمہ برگِ گلاب سے کا ہے

یہاں خزاں کے بگولے اُٹھیں تو ہم نفسو
چراغ سب کے بجھیں گے عذاب سب کا ہے
(سبھی شریک ہیں، شب خون، ص ۹)

ہ۔۔ قبائلی روایات سے اختلاف

کٹ مرے اپنے قبیلے کی حفاظت کے لیے
مقتل شہر میں ٹھہرے رہیں، جنبش نہیں کی
(شہر سخن آراستہ، ص ۱۸۴)

ہر جگہ ہر ملک ہر قوم و خاندان میں چند روایات ایسی ہوتی ہیں جن پر عمل کرنا لازمی ہوتا ہے اور ان سے اختلاف و بغاوت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان قدیم روایات کی طرف نگاہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ کچھ روایات ایسی ہیں جو انتہائی فرسودہ اور غیر مناسب ہیں۔ ان روایات کی بنیاد جہالت پر مبنی ہوتی ہے۔ پاکستانی معاشرے میں کچھ ایسی روایات موجود ہیں جو انسان کی آزادی اور حقوق انسانی سے متصادم نظر آتی ہیں۔ انہوں نے ایک نظم "منسوبہ" کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ رسم مشرقی روایات میں عمومی اور قبائلی روایات میں خصوصی طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔ جدید دور میں رفتہ رفتہ ان رسومات و روایات کا خاتمہ ہو رہا ہے۔

انہوں نے صرف آمریت، سیاسی نظام اور سماجی پہلوؤں کی مخالفت نہیں کی بلکہ ملک میں خصوصاً اپنے قبیلے میں پائی جانے والی ایسی روایات سے بھی شدید اختلاف کیا ہے جو حقوق انسانی اور خود مختاری سے متصادم ہوں۔ انہوں نے اپنے قبیلے کی شادی بیاہ کی رسم و رواج کی قدیم روایات سے بغاوت کرتے ہوئے ایسے رسم و روایت کو سرے سے ہی ماننے سے انکار کیا۔

انہوں نے اپنی منسوبہ سے مخاطب کی صورت میں اسے بتادیا کہ خود مختاری و آزادی میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ انہوں نے اپنے قبیلے کی اس رسم کو جبر و اکراہ، غیر منطقی اور غیر انسانی روایت قرار دیا ہے۔ انہوں نے اپنی منسوبہ کو اس بات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک غلط رسم و روایت ہے۔ انہوں نے اپنی منسوبہ کو بھی اس رسم و روایت سے بغاوت پر اکسانے کی بھی سعی کی ہے۔

تو نے دیکھا ہی نہیں مجھ کو تجھے کیا معلوم
وقت نے آج کسے سونپ دیا ہے تجھ کو

کس کے دامن سے ہے باندھا گیا پلو تیرا
کس سے تقدیر نے وابستہ کیا ہے تجھ کو
(منسوبہ، تنہا تنہا، ص ۱۳۸)

انہوں نے کھل کر اس روایت کی مخالفت کی ہے اور دوسروں کی طرح دوڑی اختیار کرنے سے گریز کیا ہے۔ ان کا اس رسم سے اختلاف کرنے کے باوجود خود اسی رسم کی زد میں آنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

"احمد فراز زندگی بھر ان ترقی پسندوں کی صف میں شامل ہونے سے گریزاں رہے جو سر عام تو انقلابی اصول و اقدار کا دم بھرتے ہیں مگر درون خانہ مروجہ فرسودہ رسومات کو سینے سے لگائے رہتے ہیں۔۔۔ انہیں اپنے آباؤ اجداد پر فخر تھا مگر آباؤ اجداد سے ورثے میں ملنے والی ایسی روایات سے نفرت تھی جن سے انہیں اپنے انسانی شرف اور عزت نفس کی توہین کے اندیشے لاحق تھے وہ عمر بھر ایسی روایات سے بغاوت کے راستے گامزن رہے۔" (۱۷)

اسلامی روایات کے مطابق والدین کی ذمہ داری ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں جب بلوغت تک پہنچ جائیں تو ان کے لیے مناسب اور معقول رشتے کا اہتمام کریں اور اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی شادی ایمان داری کی بنیاد پر کی جائے۔ اسلام نے ایمان کو فوقیت و اہمیت دی ہے۔ ہمارے معاشرے میں رشتے اور شادی کے موقعوں پر اسلامی احکام کے کوئی آثار نظر نہیں آتے بلکہ لوگ اسلام کے حکم کے برعکس نظر آتے ہیں۔ لڑکی اور لڑکے کے والدین رشتہ تلاش کرتے وقت اور رشتہ طے کرتے وقت ایک دوسرے کی مالی حیثیت اور جائیداد وغیرہ کو فوقیت و اہمیت دیتے ہیں۔ انہوں نے اس معیار کو اسلامی نکتہ نگاہ سے نہیں بلکہ انسانی آزادی، معاشرتی غیر حقیقت پسندی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ماننے سے انکار کیا۔ انہوں نے والدین کے اس غلط اقدام اور فیصلے کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے اپنی منسوبہ کو حقیقت بیانی کر کے تہی دستی اور احوال زندگی کو بیان کیا ہے تاکہ کہیں وہ خوش فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔

جو سجائی گئی فردوس نمائش کے لیے
وہ کسی اور کی تعمیر ہے میری تو نہیں

یہ مکانات یہ جنر یہ دکانیں یہ زمین
میرے اجداد کی جاگیر ہے میری تو نہیں
(منسوبہ، تنہاتہا، ص ۱۳۹)

قوم و قبیلے کی قدیم رسم و روایت سے بغاوت کرنا انتہائی مشکل کام ہے لیکن انہوں نے بغاوت کی اور اس پر ثابت قدم رہنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک اس موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں:
"فراز کے بروقت انتباہ کا کسی نے کوئی اثر نہ لیا۔ جو بزرگوں نے چاہا تھا وہی ہو کے رہا اور فراز اس "رشتہ بے ربط" کو رشتہ لطیف بنانے میں منہمک ہو گئے۔۔۔ اپنے اجداد کی جاگیر سے کوئی نہیں لیا۔ اپنے بچوں کو قابل رشک حد تک کامیاب زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے کی خاطر بذاتِ خود دو سائل مہیا کیے۔" (۱۸)

کشور ناہید کی تحریر سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انہوں نے آبا و اجداد کی جاگیر سے کچھ بھی نہیں لیا۔ وہ اپنی منسوبہ کو اس بات پر آگساتے رہے کہ تم اپنا حق استعمال کر سکتی ہو۔ ابھی بھی بغاوت کر کے آزاد ہونے کا موقع ہے۔ انہوں نے منسوبہ کو اس رسمِ دیرینہ و فرسودہ کے سامنے گردن جھکانے سے باز رہنے کی بات کی اور منسوبہ کو اس غلط رسم میں خود کو جکڑ کے خاموش رہنے کے خطرناک نتائج سے بھی آگاہ کیا ہے۔ وہ روایات و رسومات کے بتوں کو توڑنے کی جرأت و حوصلہ دیتے ہوئے لکھے ہیں:

سوچ ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں
ورنہ اس رشتہ بے ربط پہ پچھتائے گی
توڑ ان کہنہ رسومات کے بندھن ورنہ
جیتے جی موت کے زندان میں اتر جائے گی
(منسوبہ، تنہاتہا، ص ۱۴۱)

انہوں نے ایک اور قبائلی رسم کی شدید مخالفت کی ہے۔ وہ رسم "لختی" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ انسان کی عزت نفس مجروح کرنے والی رسم ہے۔ یہ ایک ایسی رسم ہے جس کو دیکھ کر انسان کا خون کھول اٹھتا ہے۔ بنیادی طور پر ان کی یہ نظم ایک فرمائشی نظم ہے۔ جب سرحد نمبر شائع ہونے لگا تو ان سے وہاں کی تہذیب و ثقافت رسم و رواج کے بارے میں لکھنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے لختی رسم کے بارے میں لکھا۔ لختی رسم کتنی انسانیت دشمن عزت نفس مجروح کرنے والی رسم ہے اس کے بارے میں پر تور و ہیلہ لکھتے ہیں:

”لختی پختون معاشرے کے وہ نوجوان خوب رولڑ کے تھے جو پشتواز پہنے گھنگرو باندھے عورتوں کا روپ دھارے اس وقت کی بیاہ شادیوں میں ناچا کرتے تھے۔ اس انسانیت سوز پیشے کے خاموش تماشاخیوں کے بے حس معاشرے میں بھی سب سے پہلی آواز فراز ہی کی تھی۔“ (۱۹)

اس رسم کے تحت اپنی خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے غربت زدہ لوگوں کی عزت سے کھیلا جاتا ہے۔ غربت کے مارے ہوئے لوگ شکم کی آگ بجھانے کے لیے طرح طرح کی ذلتیں اٹھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں اس رسم اور غیر انسانی عمل پر وہ تڑپ اٹھتے نظر آتے ہیں۔ اس نظم میں انہوں نے چند سکوں کے لیے غربت زدہ لوگوں کی عزت کی نیلامی اور انسانیت کے جذبے سے عاری لوگوں کے رویے اور بے حس معاشرے پر نوحہ گری کی ہے:

زندگی بال فشاں ، خاک بہ رُخ ، نالہ بلب
منجد ، ساکن و حیران ہیولے کی طرح
چند تابنے کے تراشے ہوئے سکوں کے عوض
ڈھول کی تھاپ پہ رقصاں ہے بگولے کی طرح
(لختی، تنہا، ص ۱۳۰)

فراز کا تعلق ایک پٹھان قبیلے سے تھا۔ اس بنا پر وہ بہت ہی جذباتی انسان تھے۔ انہوں نے کئی مقامات پر اس کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ عملی طور پر ان کے جذباتی پہلو کی طرف دیکھیں تو پٹھانی روش اپناتے ہوئے دوسروں سے اُلجھنے، جھگڑنے کے کئی واقعات ملتے ہیں۔ جب پروین شاکر کراچی سے اسلام آباد آئیں تو ان کے اعزاز میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں راولپنڈی اسلام آباد کے تمام ادیب و شاعر موجود تھے اس محفل میں صدیق سالک اور ڈاکٹر ایوب مرزا بھی تھے۔ ان دنوں صدیق سالک ایوانِ اقتدار سے وابستہ تھے۔ فراز اور ڈاکٹر ایوب مرزا کے مابین تعلقات کشیدہ تھے۔ فراز کی اس محفل میں شرکت اور ڈاکٹر ایوب کے ساتھ بد مزگی کے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منشا یاد لکھتے ہیں:

”۔۔۔ پروین شاکر اپنا کلام سنار ہی تھیں۔ احمد فراز نے حاضرین پر ایک نظر دوڑائی اور بریگیڈیئر صدیق سالک جو سالک کرنل سالک تھے اور ایوانِ صدر سے وابستہ تھے کو دیکھ

کر مشتعل ہو گئے اور ان کی طرف دیکھ کر کہا یہاں تو بڑے بڑے منافق لوگ بیٹھے ہیں۔
 اتفاق سے صدیق سالک کے قریب ڈاکٹر ایوب مرزا بھی موجود تھے۔۔۔ وہ سمجھے کہ فراز
 نے ان پر جملہ کسا اور انہیں منافق کہا ہے۔ وہ فراز سے الجھ پڑے اور دونوں میں دھکم پیل
 اور مار کٹائی ہو گئی جس کے نتیجے میں فراز نیچے بھی گر گئے۔ محفل درہم برہم ہو گئی۔“ (۲۰)

و۔ نا انصافی کے خلاف مزاحمت

معاشرے میں ظلم و بربریت، استحصال اور حقوق کی عدم دستیابی کے سد باب کا ایک بہت بڑا وسیلہ
 عدالت ہے۔ یہ نہایت حساس نظام ہے کیونکہ اس ایوان میں انسانوں کی آزادی، خود مختاری اور حقوق کے
 حوالے سے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ عدل اور ظلم میں فرق اور تمیز کرنا عدالت میں بیٹھے ہوئے ججوں کی اہم ترین
 ذمہ داری ہے۔ اگر ملک کا عدالتی نظام مستحکم ہو، منصفین کسی مصلحت و مراعات اور نوازشات کا شکار ہوئے بغیر
 فیصلہ کرتے رہیں تو عوام زیادہ سے زیادہ اپنے حق سے استفادہ کرتے ہوئے سکھ کا سانس لے سکتے ہیں۔ عدالتی
 نظام میں محور و مرکز خود منصف اور اس کی زندہ ضمیری ہے اگر وہ سچ اور حق پر مبنی فیصلہ صادر کرتا رہے تو عادلانہ
 معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ اگر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ منصف کیسا ہونا چاہیے؟ اور اس کی کیا شرائط ہیں؟ تو تاریخ
 عدالت کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ تاریخ عدالت میں حضرت علیؑ کی عدالت نہایت اعلیٰ و ممتاز اور عدیم المثال
 نظر آتی ہے۔ حضرت علیؑ کی عدالت سے غیر مسلم لوگ بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ حضرت علیؑ کی عدالت کے
 موضوع پر ایک غیر مسلم نے ضخیم کتاب "صوت عدالت الانسانیہ" کے عنوان سے لکھی ہے۔

حضرت علیؑ نے ایک موقع پر فرمایا کہ اگر دنیا و مافیہا مجھے عطا کرے اور علیؑ سے یہ تقاضا کرے کہ کسی
 چیونٹی کے منہ سے گندم کا چھلکا چھین لے تو علیؑ اس کو ظلم شمار کرتے ہوئے ہرگز تیار نہیں ہوگا۔ حضرت علیؑ کا
 یہ تصورِ ظلم دینا اور دنیا کی منصفوں کے لیے ایک بہت بڑا فلسفہ، نظریہ اور ایک ذمہ دارانہ راہ کی طرف رہنمائی
 ہے۔ کس بھی ملک و قوم میں روز بروز بڑھنے والی خرابیوں میں عدالت کی چشم پوشی اور ناقص کارکردگی کو نظر
 انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جس طرح وطن عزیز پاکستان کو قائد اعظم کے بعد مخلص رہنما اور لیڈر کم ہی نصیب ہوا اسی طرح
 جسٹس عبدالرشید کے بعد کوئی بے داغ منصف کم ہی نصیب ہوا۔ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد مسند عدالت پر
 بیٹھ کر انصاف کا تقاضا پورے کرتے ہوئے فیصلے صادر کیے۔ ان کی شفاف منصفی اور فیصلے کی واضح دلیل یہ ہے کہ

انہوں نے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو اپنے گھر نہ آنے کا پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس وقت میں حکومت کے خلاف کیس کی سماعت کر رہا ہوں۔ آج بھی قوم جسٹس عبدالرشید اور جسٹس بھگوان داس جیسے منصفوں کو احترام اور محبت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ لوگ باضمیر ججوں کی تاریخ کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے پر نام اپنے بچوں کے نام فخر سے رکھتے ہیں۔

ملکی عدالت کی تباہی و بربادی بدنام زمانہ جج جسٹس منیر کی نظریہ ضرورت سے ہوئی۔ ان کے نظریہ ضرورت سے پہلے اس وقت مولوی تمیز الدین نے پامردی کے ساتھ اس ملک کے قانون و آئین سے کھیلنے والوں کے خلاف مقدمہ لڑا اور وہ کامیاب ہوئے تھے لیکن بعد میں انہی بدنام زمانہ جج نے مراعات وغیرہ کی خاطر اس مقدمے کا فیصلہ تبدیل کر دیا۔ مولوی تمیز الدین کی آئین کی بالادستی کے لیے کی جانے والی کوششوں کے بارے میں احمد سلیم لکھتے ہیں:

"سندھ ہائی کورٹ نے فریقین کے دلائل سُنے۔ مولوی تمیز الدین خان کی طرف سے برطانوی وکیل نے دلائل دیے طویل سماعت کے بعد عدالت نے مولوی تمیز الدین خان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ عدالت نے قرار دیا کہ دستور ساز اسمبلی توڑنے کا اختیار گورنر جنرل کو نہیں تھا۔" (۲۱)

پاکستان کی جمہوریت کو پٹری سے اُتارنے کے کارنامے میں پاکستان کی عدالت کا کردار بھی رہا ہے۔ مظلوم و محکوم لوگوں کو حقوق ملنے کے بجائے ان کے خلاف سزائیں سنانے کا اعزاز بھی عدالت کو جاتا ہے۔ اس جج نے نظریہ ضرورت جیسی بدعت کو رواج دے کر ملک کی عدالت میں ایسا وائرس داخل کر دیا جس کے اثرات ابھی تک پائے جاتے ہیں۔ سہیل وڑائچ عدالت کی کارکردگی کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

"مولوی تمیز الدین کے مقدمے میں اگر پاکستان کی پہلی منتخب اسمبلی توڑنے کو جائز قرار نہ دیا جاتا تو شاید آج پاکستان مضبوط روایات کا جمہوری ملک ہوتا۔ جسٹس منیر کے نظریہ ضرورت کی یہ روایت جاری رہی کئی اسمبلیاں ٹوٹیں اور کئی منتخب حکومتیں رخصت ہوئیں لیکن جمہوریت کے حق میں بڑے فیصلے دینے میں ناکام رہی۔" (۲۲)

بعض مصنفین کرام جاہ طلبی اور لالچ میں آکر غیر قانونی قدم اُٹھاتے ہوئے تمام اصول و قانون کو پاؤں تلے روندتے ہوئے مسند عدالت پر براجمان نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل محکوم و زرخیر غلام اور بے ضمیر

لوگ ہوتے ہیں۔ یہی لوگ کچھ مدت کر سی عدالت پر رہنے کی ہوس لے کر اپنی عزت اور عدالت کا وقار مجروح کرتے ہیں۔

ملک میں تمام آئینی طریقوں اور شرائط و اصول پر کاربند ہوتے ہوئے منصفِ اعلیٰ کی مسند پر آنے والوں کی تعداد بہت کم ہوگی۔ فراز نے مراعات و منصب کے لیے حکومت کے غیر آئینی اقدامات کی حمایت کرنے والے ان منصفین کرام پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے:

معززین عدالت حلف اٹھانے کو

مثال سائل مبرم نشستہ راہ میں ہے

(محاصرہ، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۹۱۵)

یہ سب جانتے ہیں کہ اکثر عدالت میں انصاف کم ہی ملتا ہے۔ اکثر وہاں انصاف کا خون ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ لوگوں کا روپیہ، پیسہ اور ان کی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ انصاف کے لیے عدالت کا در کھٹکھٹاتے رہتے ہیں اور مرنے کے بعد یا سب کچھ ختم ہونے کے بعد کہیں جا کر ان کے حق میں فیصلہ آجاتا ہے۔

اب تو عدالت قوت، طاقت، اور ثروت کے زیرِ دام آ کر ظالموں کے جرم و ظلم کو بے خطا قرار دیتی چلی آرہی ہے۔ جب میزانِ عدل غیر متوازن ہو جاتا ہے تو اس صورتِ حال میں مظلوم فریادی کو انصاف ملنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ عدالت مقتدر قوتوں اور سرمایہ داروں کے اشاروں پر فیصلہ صادر کر کے عدل و انصاف کا جنازہ نکال کر قاتل کے ہر جرم کی پردہ پوشی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اپنی شاعری میں انہوں نے عدالت کے مرعوب ہونے اور بے ضمیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

لہولہان تھا میں اور عدل کی میزان

جھکی تھی جانبِ قاتل کہ راج اُس کا تھا

(پس انداز موسم، ص ۱۶)

ملک کے انتظامی امور ہوں یا عدالتی نظام ان میں ایک بہت بڑا نقص اور خرابی یہ ہے کہ وہاں ظالم و مظلوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر کے ایک ہی ڈنڈے سے ہانکا جاتا ہے۔ انہوں نے اس عدالتی و انتظامی خرابی کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا تھا۔

دیکھ اے صاحبِ انصاف ، عدالت اپنی
ہم بھی قاتل کے مقابل ہیں ترازو میں پڑے
(اے عشق جنوں پیشہ، ص ۸۴)

ز۔ صنفی امتیازات کے خلاف مزاحمت

مذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فراز
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں
(درد آشوب، ص ۲۳۲)

مرد اور عورت انسان اور مخلوق خدا ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔
دُکھ درد، خوشی اور غم کی کیفیت ایک طرح کی ہوتی ہے اس میں کوئی تفاوت نہیں پایا جاتا۔ دورِ قدیم اور دورِ
جہالت کی طرح اکیسویں صدی میں بھی صنفِ نازک پر ہر طرح کے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ صنفِ نازک پر
ظلم کی ابتدا عرب کے غیر مہذب معاشرے میں بسنے والے جاہل لوگوں کے ذریعے ہوئی۔ عرب معاشرے
کے لوگ اپنے ہاں بیٹی کی پیدائش کو نہ صرف ننگ و عار سمجھتے بلکہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن دیتے تھے۔ ان کی غلط
فکر اور سوچ کے بارے میں قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: "اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خبر دی جاتی ہے تو مارے غصے کے اس کا منہ
سیاہ ہو جاتا ہے۔" (۲۳)

جب ان لوگوں کو بیٹی کی پیدائش کا پیغام سنایا جاتا تو چہرہ خوشی سے کھل اٹھنے کے بجائے شرم و غم سے
مر جھا جاتے تھے۔ لیکن اس دور میں بھی یہ تصور و فکرِ بلا امتیاز روشن خیال لوگوں اور مذہبی لوگوں کے ہاں کم و
بیش پائی جاتی ہے۔ عورتوں پر کیے جانے والے ظلم و ستم کے بارے میں ادیب اپنے دردِ دل اور احساسات کا برملا
اظہار کرتے چلے آ رہے ہیں۔

ستم بالائے ستم کہ لوگوں کو اسلام اور حقوقِ بشر کے بارے میں درس دینے والے مذہبی طبقے میں ایسے
افراد موجود ہیں جو ظلم و بربریت کی حدوں کو عبور کرتے ہوئے خواتین پر سفاکانہ تشدد کرتے ہیں۔ اب تو
صورت یہاں تک جا پہنچی ہے کہ گھریلو سطح پر عورتوں کو مارنے پیٹنے کو جرم و ظلم شمار ہی نہیں کیا جاتا اور صنف

نازک پر جنسی تشدد کے ساتھ ناروا اور غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ عورتوں پر تیزاب پھینکنے جیسا ناقابل تصور ظلم معاشرے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

ان کی شاعری میں عورتوں پر کیے جانے والے مظالم کے خلاف احتجاجی اشعار موجود ہیں۔ دوسرے ادبا و شعرا نے بھی اس ناروا سلوک کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ امیر گھرانوں میں چند پیسوں کی خاطر دن رات خدمت و مشقت کرنے والی عورتوں کو جانور سے بھی کم حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ روز و شب محنت شاقہ سے دوچار ہونے والی خدمت گزار جو کہ حقیقت میں کنیز کی زندگی گزار رہی ہوتی ہیں ان کو دو وقت کی روٹی نہایت مشکل سے ملتی ہے۔ جبکہ انہی کے گھروں میں رکھے گئے کتوں کی اچھی خوراک و غذا کا انتظام ہوتا ہے۔ آج بھی غریب والدین کی معصوم بچیاں کھیلنے کودنے کی عمر میں امیر لوگوں کے گھرانوں میں مجبوس ہو کر ان کے زیرِ عتاب کام کر رہی ہیں۔ بعض کلیوں پر تشدد کرنے کی رپوٹیں اور خبریں شائع ہو رہی ہوتی ہیں۔

غریب عورتوں کا کوئی جرم نہیں ہوتا لیکن پھر بھی سزائیں انہی کے حصے میں آ جاتی ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ غریب گھرانوں کی عورتوں کی زندگیاں دولت مندوں کی خدمت گزاری کرتے ہوئے انتہائی صعوبت میں گزر جاتی ہیں۔ اس سے بھی بڑا ظلم و ستم یہ ہے کہ خدمت و ملازمت کرتے ہوئے ان امیروں اور امیر زادیوں کی رازوں کو جاننا ان کی غلطیوں کی طرف نگاہ پڑنا بھی ان بچاریوں کا خطرناک جرم شمار ہوتا ہے۔ امیر طبقے اپنے راز فاش ہونے پر پاگل پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان غریبوں پر تہمت و الزام لگا کر ان کو مجرم ٹھہراتے ہوئے سزائیں دلاتے ہیں یا ان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ احمد فراز نے عورتوں پر ہونے والے ظلم و ستم کے موضوع پر "بانو" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے بانو کو ایک استعارہ بنا کر معاشرے میں موجود مظلوم عورتوں کی ذلت، بے قدری، جھوٹے الزامات میں قتل کرنے کے مکروہ عمل پر شدید تنقید کی ہے۔ اس نظم کے موضوع و اہمیت کے بارے میں اشفاق حسین لکھتے ہیں:

"اگر اپنی نظم 'کنیز' میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر طنز کیا ہے تو بانو کے نام

نظم لکھ کر انہوں نے اپنی شاعری کے احتجاجی لہجے کی لے کو اور بھی تیز کیا ہے اور ایک

شاعر کی سماجی ذمہ داری کا ثبوت بھی دیا ہے۔" (۲۴)

یہ انسانی تاریخ اور معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے کہ جرم و خطا امیر اور ان کی بیگمات کریں اور ان کے بھید جاننے کی وجہ سے بے خطاؤں کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں اور ان کو جان سے مار دیا جائے۔ انہوں نے اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کر کے بتایا ہے:

یہی سنا ہے بس اتنا قصور تھا تیرا
کہ تو نے قصر کے کچھ تلخ بھید جانے تھے
تیری نظر نے وجہ خلوت کدوں کے داغ گئے
جو خواجگی نے زر و سیم میں چھپائے تھے
تجھے معلوم نہیں تھا کہ اس خطا کی سزا
ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے
(بانو، تنہا، ص ۵۷)

نہ جانے آج کے دور میں بھی کتنی بانو امیروں، جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں تشدد کا شکار ہو کر مر رہی ہوں گی۔ اخبارات اور سوشل میڈیا میں بھی اس طرح کی خبریں چل رہی ہوتی ہیں۔ ان کی اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ نواب آف جونا گڑھ کی بیگم نے سفاکیت کی انتہا کرتے ہوئے اپنی کنیز کو قتل کر کے بات فخرانہ انداز میں کہی تھی کہ میں نے ایسی بلیاں اور کنتیاں بہت ماری ہیں۔ ان کو جب مختلف موضوعات کے بارے میں شعر لکھنے کو کہا تو انہوں نے کہا تھا کہ نہ ہمارے ملک کے حالات بدلتے ہیں نہ ہماری نظمیں بدلتی ہیں۔ اس نظم کو معاشرتی سطح پر کیسے پذیرائی ملی یا یہ کتنی حقیقت پر مبنی تھی اس حوالے سے ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی نے لکھا ہے:

"جب میں نے یہ نظم کراچی میں پڑھی تو کچھ لوگ مجھ سے ملنے آئے اور ان میں ایک نے کہا کہ آپ نے میری بیٹی کو زندہ جاوید کر دیا، میں ایک مقتولہ کا باپ ہوں۔" (۲۵)

اس طرح کی ظلم و زیادتی کا سلسلہ عرصہ دراز سے چلا آ رہا ہے۔ طاقت و دولت کے بل بوتے پر مجرم کو بے قصور اور بے گناہ کو قصور وار ٹھہرایا جاتا ہے۔ لوگ مر عوب ہوتے ہوئے قاتل اور مجرم کے طرف دار اس لیے ہوتے ہیں کہ زمام اقتدار و طاقت ان کے قبضے میں ہوتا ہے، اس کی واضح مثال انارکلی کا واقعہ ہے۔ شہنشاہ اکبر نے انارکلی کو دردناک اذیت دیتے ہوئے دیوار میں چنوا کر ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا لیکن اپنے بیٹے سلیم کو اس

طرح کی سزا دینے کا خیال بھی نہیں کیا۔ اگر حقیقتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو دونوں مجرم تھے لیکن انارکلی ایک مخلصانہ کی حیثیت رکھتی تھی اور سلیم شہزادہ تھا اس لیے انارکلی ظلم کی چکی میں پس گئی۔ دنیا کی یہ روش قابلِ نفرت ہے جہاں بے گناہوں کو گناہ گار بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔
بقول احمد فراز:

مگر یہ تخت یہ سلطان ، بیگمات یہ قصر
مورخین کی نظر میں بے گناہ رہے
بعض وقت اگر کوئی راز کھل بھی گیا
زمانے والے طرفدار کجلا رہے
ستم کی آگ میں چلتے رہے عوام مگر
جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ رہے
(بانو، تنہا تنہا، ص ۵۹)

اس نظم کے بارے میں اپنی رائے، توضیح و تشریح اور اس کے پس منظر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے پرتو و ہیلہ نے نواب کی بیگم کو سزا نہ ہونے پر پاکستان پر بہت بڑی تنقید کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ”جرم ثابت ہو جانے کے باوجود حکومت پاکستان کے ایما پر عدالت نے (شاید نظریہ ضرورت) اُسی احسان کے عوض کہ نواب جو ناگڑھ نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا تھا، ان کی بیگم کو صرف عدالت برخواست ہونے تک قید کا اعلان کیا۔“ (۲۶)

مہذب اور نظریاتی معاشرے میں غربت و افلاس کی آزمائش میں پڑے ہوئے لوگوں کی مدد کی جاتی ہے۔ کسی بھی معاشرے میں عورتوں کے جرائم پیشہ ہونے میں خود ان سے زیادہ اس معاشرے کے لوگ ذمہ دار ہوتے ہیں کیونکہ اس سماج میں بھوک سے بلک کر مرنے والوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا تو مختلف جرائم و بُرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ غیر انسانی معاشرے میں رہنے والے لوگ ان غریب اور نادار لوگوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کی غربت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے نظر آ جاتے ہیں۔ قابلِ نفرت رُحمان رکھنے والے سرمایہ دار اور صاحبِ اقتدار اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے نادار، مجبور اور بے سہارا عورتوں کی عزت و ناموس کی تقدس کا خیال نہیں رکھتے۔

حضور کیا کہا، میں اس کو بہت عزیز ہوں
حضور کا کرم ہے ورنہ میں بھی کوئی چیز ہوں
حضور چھوڑیے ہمیں ہزار روگ ہیں
ضور جانیے کہ ہم بہت غریب لوگ ہیں
(کنیز، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۷۸)

ہمارے معاشرے میں غربت اور کسمپرسی کی حالت میں لوگ بہت تلخ زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ لوگ
اپنی غربت کی وجہ سے اپنے آپ کو انسان تصور نہیں کرتے بلکہ اپنی حیثیت کی نفی کرتے ہیں۔ فراز نے
معاشرے میں موجود سفاک بھیڑیوں اور نظریاتی معاشرے کے بے غیرت افراد کے کرتوت اور ان کی ہوس
کی بھینٹ چڑھنے والوں کی حالت زار بیان کر کے غیرت مندوں کو جھنجھوڑا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ بابر سعید، جسم و جاں، مشمولہ احمد فراز، شخصیت و فن، زیتون بانو، تاج سعید مرتبین، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، سن، ص ۳۵۹
- ۲۔ فضہ پروین رانی، کتاب، احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۱ اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۱۶۰
- ۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، جاگیر داری، فکشن ہاؤس لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۳
- ۴۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، لمحہ موجود کے امکانات کا شاعر، مشمولہ احمد فراز شخصیت و فن، زیتون بانو تاج سعید، مرتبین، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ص ۹۲
- ۵۔ فیضان عارف، احمد فراز سے خصوصی گفتگو، مشمولہ کتاب احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۱ اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۱۷۴
- ۶۔ ثاقب رزمی، احمد فراز اور غم دوران، مشمولہ احمد فراز شخصیت و فن، زیتون بانو تاج سعید، مرتبین، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ص ۷۹
- ۷۔ معصوم شرقی، ڈاکٹر، احمد فراز نئی شعری آفاق کا مسافر، مشمولہ شاخ نہال غم (احمد فراز فن و شخصیت)، مرتبہ، عشرت ظفر، جگر اکیڈمی کانپور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۸
- ۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، جاگیر داری اور جاگیر داری کلچر، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۲
- ۹۔ عابد حسن منٹو، فراز، مشمولہ ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جلد ۱۸، شمارہ ۸۱ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۴
- ۱۰۔ معصوم شرقی، ڈاکٹر، احمد فراز نئی شعری آفاق کا مسافر، مشمولہ شاخ نہال غم (احمد فراز فن و شخصیت)، مرتبہ، عشرت ظفر، جگر اکیڈمی کانپور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۸
- ۱۱۔ شمیمہ راجا، مشمولہ کتاب احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۱ اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۹۰
- ۱۲۔ قمر رئیس، پروفیسر، تعبیر و تحلیل، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۴۴

- ۱۳۔ مسعود مفتی، اب فن میرا دربار کی جاگیر نہیں ہے، مشمولہ ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جلد ۱۸، شمارہ ۸۱ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۹۵
- ۱۴۔ ناصر زیدی، عہد موجود کا سب سے بڑا شاعر احمد فراز، مشمولہ چہار سو راولپنڈی، جلد ۳، شمارہ ۳۰، ۳۱ جنوری، فروری، ۱۹۹۵ء، ص ۳۰
- ۱۵۔ طاہر محمد خان، احمد فراز کا سماجی رویہ اور مزاحمتی شاعری، مشمولہ ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۸ء ص ۴
- ۱۶۔ مسعود مفتی، اب فن میرا دربار کی جاگیر نہیں ہے، مشمولہ ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جلد ۱۸، شمارہ ۸۱ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۹۳
- ۱۷۔ فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۱۲، ص ۱۰۹
- ۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۸
- ۱۹۔ پرتو روہیلہ، ”شہر سخن آراستہ ہے کے چند روشن امتیازات“ مشمولہ کتاب احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۱ اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۷۵
- ۲۰۔ منشا یاد، فراز کی خوش بیانیوں، مشمولہ کتاب احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۱، اکتوبر، ص ۲۷۹
- ۲۱۔ احمد سلیم، اسمبلیاں، احتساب اور عدلیہ، سارنگ پبلی کیشنز لاہور، سن، ص ۱۶۰
- ۲۲۔ سہیل وڑائچ، عدلیہ کے عروج و زوال، ساگر پبلشرز لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۷
- ۲۳۔ قرآن مجید مترجم شیخ محسن علی نجفی، سورہ النحل، آیت: ۵۸، دار القرآن الکریم جامعۃ الکوثر اسلام آباد، طبع ہفتم ۲۰۱۶ء، ص ۳۶۱
- ۲۴۔ اشفاق حسین، احمد فراز یادوں کا ایک سنہرا ورق، وجدان پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۹ء ۹۸؟
- ۲۵۔ حمید اللہ صدیقی، ڈاکٹر، شاعر احتجاج، احمد فراز، مشمولہ، شاخ نہال غم، احمد فراز فن و شخصیت، مرتبہ عشرت ظفر، شاخ نہال غم، جگر اکیڈمی کانپور، ۲۰۰۹ء ص ۸۲
- ۲۶۔ پرتو روہیلہ، ”شہر سخن آراستہ ہے کے چند روشن امتیازات“ مشمولہ کتاب احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۱ اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۷۵

باب چہارم:

احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت کی مذہبی جہت

الف۔ مذہب و مسلک اور فقہی اختلافات کی بنا پر انتہا پسندانہ رویہ

تمام ادیانِ عالم و مذاہب میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عیسائیت میں کیتھولک اپنے آپ کو مذہب کا پیشوا سمجھتے تھے اور عیسائیت کی تعلیم اور بائبل کی تشریح کرنے کا حق صرف اپنے لیے مختص سمجھتے تھے۔ ان کے اس نظریے کے خلاف لوگوں نے بغاوت کی۔ مارٹن لوتھر کو اس تحریک و بغاوت کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ اس تحریک و بغاوت کے نتیجے میں ایک اور فرقہ "پروٹسٹنٹ" کے نام سے وجود میں آیا۔

اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اختلافی باتیں نظر آتی ہیں۔ مذہبِ اشاعرہ اور معتزلہ کے مابین خلقتِ قرآن کی بحث شدت کے ساتھ ہوتی رہی ہے۔ جب یہ بحث چل رہی تھی تو اُس وقت مسند و حکومت پر مامون الرشید متمکن تھا وہ خود بھی معتزلہ مسلک کا حامی تھا۔ اُس نے علما پر جبر کرتے ہوئے نظریہ خلقِ قرآن کو قبول کرنے اور علما سے اس کی تصدیق کروانے کی کوشش کی۔ اسی بحث و تحقیق کی پاداش میں امام احمد بن حنبل کو قید و بند کی سزا سنائی گئی۔ قاضی نور اللہ شوستری جو کہ شہیدِ ثالث کے نام سے مشہور ہیں، ان کو مسلکی اور فقہی اختلاف اور کتاب "احقاق الحق" لکھنے پر سفاکانہ انداز میں شہید کر دیا گیا۔

مذہبی انتہا پسندی اور مسلکی تعصب پیدا کر کے اسلام کو بدنام کرنے کے لیے مغربی ممالک اور طاقتیں مصروفِ عمل رہے ہیں اور یہ تسلسل ابھی بھی جاری و ساری ہے۔ یہ طاقتیں کسی حد تک اپنے مذموم عزائم میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ آج بھی باطل قوتیں چند مذہبی افر کو اپنی گرفت میں لے کر ان کے ذریعے اپنی سازشوں کو کامیاب کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے اور کسی نہ کسی طرح اس روشن دین کو بدنام کرنے کے لیے دولت کا بے دریغ استعمال کرنے والے ممالک اور سازش کاروں کے بارے میں بات کرتے ہوئے شہباز رشید لکھتے ہیں:

"مغرب کا یہ مقصد ہے کہ اسلام کو دیگر مذاہب کی طرح محض ایک مذہب بنایا جائے،

حالانکہ یہ عمل آفتاب کو قندیل بنانے کے مترادف ہے۔" (۱)

اہل سنت اور اہل تشیع میں مشترکات زیادہ ہیں جب کہ اختلافی مواضع و نکات کم ہیں۔ دونوں مسالک کے علما آپس میں مل بیٹھ کر علمی طریقے سے بحث و مناظرہ کرتے تھے۔ ان گنے چنے اختلافات میں "اللہ تعالیٰ کی رویت، اور آخری نبی حضرت محمدؐ کے بعد ان کی نیابت و ولایت کا آغاز امامت کے عنوان سے یا خلافت کے عنوان سے ہونے جیسے موضوعات پر علما اختلاف رائے رکھتے ہوئے علمی طریقے سے بحث کرتے چلے آ رہے تھے۔ اختلاف ہونے اور علمی انداز میں بحث کرنے سے انسان نئے علوم سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے احادیث میں اختلاف امت کو رحمت سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ۱۸۰۰ء کے اوائل میں متشدد نظریہ و فکر رکھنے والا گروہ وجود میں آیا اور اس نے ۱۸۰۴ء میں مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ روضہ رسول کی بھی توہین کرنے سے بھی باز نہیں رہا۔

اس متشدد سوچ اور مکتب فکر سے وابستہ ہونے والے افراد بھی پر تشدد اور انتہا پسند فکر کے مالک بنے اور انہوں نے اپنے نظریہ سے اختلاف رکھنے والوں پر کفر کا فتویٰ دینا شروع کیا۔ انہی معدود چند علمائے سواور مفتیان دین کی وجہ سے شیعہ مسلک اور سنی مسلک کے درمیان دوری اور اختلاف کی نئی لہر پیدا ہو گئی۔ اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حمزہ اسماعیل نے کہا ہے کہ "شاہ عبدالعزیز نے اپنی کتاب میں حد سے تجاوز کرتے ہوئے شیعہ سنی مشترکات کو بھی متنازعہ بنا دیا گیا۔

عمر بن عبید علم کلام کی جانب راغب تھے لیکن امام ابو حنیفہ نے ان کی تحریروں کی مذمت کی، اور ابویوسف نے کلامی کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز قرار دیا۔ امام شافعی نے بھی ان کی مخالفت کی ہے۔ موجودہ دور میں بھی ایسے علما کی کمی نہیں جو علمی انداز میں اختلاف رائے رکھتے ہوئے دلیل کی بنیاد پر بحث و مناظرہ کرتے ہوں گے۔ لیکن اس علمی ترقی کے دور میں بھی چند مفتیان دین اپنے نظریے، سوچ اور بات کو بغیر کسی دلیل و ثبوت کے پیش کرتے ہوئے دوسرے مسلک کے خلاف غلط زبان استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مفتیان دین مغربی طاقتوں کے آلہ کار بن کر اختلافی مسائل پر من گھڑت اور ضعیف روایات اور باتیں لکھ کر تحریر کردہ کتاب کو دوسرے مسلک کے نظریہ پر مشتمل کتاب بنا کر چھاپ دیتے ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آرہی ہے کہ انتہا پسند سوچ اور فکر رکھنے والے کتابوں میں موجود مشترکات و حقائق پر دلالت کرنے والی روایات کو حذف کر کے مذہبی کتابوں میں تحریف کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اس مکروہ عمل کے ذریعے مختلف مسالک کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے سے باز رکھتے ہیں۔ ان مذہبی پیشواؤں نے تو اب ایسی

صورت حال پیدا کر دی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی مساجد میں جانے سے احتراز کرتے ہیں اور بعض مساجد میں خاص مسلک کے علاوہ دوسروں کے داخلے پر پابندی کا اعلامیہ لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے لیے بہت بڑا المیہ ہے ان کی اس سوچ کی وجہ سے مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کے بجائے شدید اختلافات اور عدم برداشت کی فضا قائم ہو رہی ہے۔

ب۔ احمد فراز کی مذہبی شاعری

حق و باطل شروع سے نبرد آزما ہوتا چلا آ رہا ہے۔ حق اور سچ کو دوام و بقا ملتی ہے جبکہ ناحق و باطل مٹ کر نابود ہو جاتا ہے۔ عرب کے غیر مہذب اور بادہ نشین معاشرے کی ظلمت، جہالت اور تاریکی کو چیرتے ہوئے محسن انسانیت نبی آخر الزمان نے شمع اسلام کو فروزاں کیا۔ صحرا نشینوں کو آدابِ زندگی و سلیقہ بندگی سکھایا۔ انسانیت کے دشمنوں کو انسان کی عظمت، عزت اور وقار کا درس دے کر وحشی سوچ و فکر کا قلع قمع کر دیا۔ دورِ جاہلیت میں رہنے والوں کو عظمتِ توقیر انسان اور مقصدِ خلق کی جانب قدم رنجہ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فطرتِ انسانی کے اصولوں سے روشناس کرایا۔ اُس معاشرے میں پسے ہوئے اور دورِ جاہلیت کی رسم و روایات کے ساتھ غلامانہ اور غیر انسانی زندگی گزارنے پر مجبور لوگوں کی بڑی تعداد اس نعرہ حق اور صدائے حق پر لبیک کہتے ہوئے حلقہ اسلام میں داخل ہو گئی۔ اسلام نے رنگ و نسل اور قوم کی بنیاد پر تعصب اور فخر و مباہات کرنے والوں کو بڑی شکست دی لیکن یہ باطل قوتیں پھر بھی حق کو دبانے کی سر توڑ کوشش کرتی رہیں۔ اسی لیے علامہ محمد اقبال نے کہا تھا:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

(ارتقا، کلیاتِ قبل، ص ۲۵۱)

اُردو ادب کی تاریخ میں سچ کا چراغ فروزاں کر کے انسانوں کو معراجِ انسانیت تک پہنچانے والی ہستی خاتم المرسلین سے عقیدت و محبت میں نعت لکھنے کی روایت شروع سے چلی آرہی ہے۔ شاعر عشقِ نبی کریم سے سرشار ہو کر توصیفِ حضرت محمد مصطفیٰ لکھتے چلے آئے ہیں۔ فراز کی عقیدت بھری شاعری کے بارے میں محبوب ظفروں رقمطراز ہیں:

"احمد فراز کا سید گھرانے سے تعلق ہے اور سادات سے محبت ان کے خون میں شامل ہے۔ نعت کا بیاں ہو یا سانحہ کربلا کا حوالہ ان کی شاعری انہی چراغوں سے روشن ہوئی ہے۔ ان کے بارے میں یہ کہا جانا کہ وہ عقیدے کی شاعری نہیں کرتے، بالکل غلط ہے۔ بلکہ ان کے ہاں تو جہاں جہاں عقیدے کا اظہار ہوا ہے، پورے خلوص سے ہوا ہے جیسے آئینہ اور تلوار کی آب ایک ہو گئی ہے۔" (۲)

انہوں نے اپنی شاعری میں حضرت محمدؐ اور ان کی آل سے محبت و عقیدت کا نہ صرف اظہار کیا ہے بلکہ وہ اپنے اشعار کے ضمن میں ان کی سیرت کو آج بھی مسلمانوں کے لیے اعلیٰ و ارفع نمونہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آج بھی مسلمان عشقِ نبیؐ میں خود کو فنا کر کے ان کے فرامین کے مطابق زندگی گزارتے ہوئے باہمی اتحاد و اتفاق کے ساتھ تمام باطل قوتوں کو نیست و نابود کر سکتے ہیں۔ ان کی نعت و سلام میں موجود فلسفہ اسلام اور تصور حریت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے رانا شبیر اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"حضور نبی کریمؐ کی ذات اقدس کے ساتھ ان کی جو والہانہ محبت اور عقیدت ہے وہ ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ حضورؐ کی ذات بابرکات کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنے ہی سے ہمارے دکھوں کا مداوا ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہوس زر و مال و جاہ منصب، فرقہ بندی اور ذات پات کی لعنتوں کے باعث پوری ملت اسلامیہ انتشار اور پراگندگی کی بھیڑ چڑھ گئی ہے۔ احمد فراز کو یقین ہے کہ اگر آج بھی ملت اسلامیہ حضور ختم المرسلینؐ کے نقش قدم پر چلے تو مصائب و آلام کے بادل چھٹ جائیں گے۔" (۳)

احمد فراز نے بھی نعت لکھی ہے لیکن ان کی نعت لکھنے کی روش عام نعت لکھنے کی روش سے کچھ مختلف ہے۔ انہوں نے اپنی نعت میں بھی مزاحمتی انداز اختیار کیا ہے۔ ان کے اسی لہجے کے بارے میں زاہد حسن لکھتے ہیں: "فراز اُردو شاعری میں اس روایت کے شاعر تھے جنہوں نے اپنی تخلیقی نشوونما کے لیے بغاوت کا خمیر چنا تھا۔" (۵)

ان کی نعت کالب و لہجہ احتجاج اور مزاحمت پر مشتمل ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ ان کی نعت اور نظموں میں ادب کا معیار نمایاں ہے یا احتجاجی پہلو ادب پر حاوی ہے۔ نظموں کے علاوہ ان کی نعت میں بھی یہ لہجہ دیکھ کر آمر اور آمریت کے داعی ان سے اُلجھتے اور ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ان کو اس طرح کی نعت سننے سے باز رہنے کی ہدایت کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی نعت میں اس بات کا اشارہ کیا تھا کہ

حضرت محمدؐ نے تمام ظلمتوں اور تاریکیوں کے پردے چاک کر کے جہالت زدہ معاشرے کو نورِ اسلام سے روشن کیا اور اس معاشرے میں رہنے والوں کو تمام شرائط و قیود سے آزاد کر کے انسانیت دُشمن عناصر سے نجات دی تھی۔ پاک پیغمبر نے صبر و جرأت، اخلاق اور حوصلہ مندی سے کام لیتے ہوئے نورِ اسلام کو دنیا میں پھیلا یا لیکن نبیؐ کی اُمت طاقت و مسند کے حصول کے لیے دینِ مبین کے پر نور اُصولوں اور چراغِ ہدایت بجھا کر اس وطن کو ظلمت کدہ بنانے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے۔ امتِ محمدی اور خاص طور پر حکمرانوں کے اس طرزِ عمل پر انہوں نے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

میرے رسول کہ نسبت تجھے اُجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے
تو روشنی کا پیمبر ہے اور میری تاریخ
بھری پڑی ہے شبِ ظلم کی مثالوں سے
(ابیات، نابینا شہر میں آئینہ ۱۱)

اس نعت میں انہوں نے رسولِ گرامیؐ کو نور اور روشنی کا رہبر و رہنما قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی امت کی ضلالت کی راہ منتخب کرنے اور ظاہری دین کے نام لیوا لوگوں، صاحبِ اقتدار افراد، اور منصفوں پر کڑی تنقید کی ہے۔ ان کے اس شکایت آمیز لہجے اور مزاحمت کے بارے میں محبوب ظفر لکھتے ہیں:

"اس نعت میں واعظانِ شہر کا شکوہ بھی ہے اور خراب حالوں کا تذکرہ بھی مگر شاعر نے کہیں بھی ستم گروں سے مصالحت نہیں کی۔" (۵)

نعت اور سلام میں بھی احتجاجی رنگ اور انداز دیکھ کر آمریت کے چیلوں اور جاسوسوں کا سر چکرانے لگا۔ وہ فراز کو طاقت کی زبان سے اس طرح کی تحریر لکھنے سے باز رہنے کی کھلی دھمکیاں دیتے رہے۔ احتجاجی لہجے پر مشتمل نعت کو حکمرانِ وقت کے خاص نمائندوں کے سامنے سنانے اور آمریت کے اہلکاروں کے ساتھ ہونے والی بحث کے بارے میں پروفیسر فتح محمد ملک اس طرح لکھتے ہیں:

"نعتیہ مشاعرہ ختم ہوا تو ریٹائرڈ جنرل شاہد حامد کرسیِ صدارت سے اُتر کر سیدھے احمد فراز کے پاس آئے اور ڈپٹ کر بولے۔ فراز! تم باز نہیں آتے، یہ تم نے کیا پڑھا۔ میں نے وہی پڑھا ہے جو میں لکھتا ہوں۔ فراز اس غیر متوقع وار سے سنبھل کر بولے۔ میں

پوچھتا ہوں، یہاں تم نے ایسی چیز کیوں پڑھی؟ شاہد حامد صاحب جوش غضب میں بھنا اُٹھے۔ میں تو وہی پڑھوں گا جو میں لکھتا ہوں، فراز نے مختصر مگر فیصلہ کن جواب دیا۔" (۶)

بعض کا خیال ہے کہ مزاحمتی ادب کی ابتداء ثنائی ادب سے ہوئی ہے اور یہ صنف ظلم و ظالم سے نفرت اور جابر حکمرانوں اور بادشاہوں سے بغاوت پر مشتمل ہوتی ہے۔ شعرا کے ہاں حمد و نعت کے ساتھ ساتھ منقبت و سلام کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ فراز کی شاعری میں بھی سلام پر مشتمل کچھ کلام موجود ہے۔

معمر کہ کر بلا حق و باطل کی پہچان ہے یہ ایک ایسی تاریخ ہے جو حق و باطل کے درمیان تمیز کرتی ہے۔ یہ روح اسلام اور حق کی بالادستی کے لیے مرٹنے اور قربانی کا درس دینے والا سانحہ ہے۔ اس عظیم سانحے سے ادیب و شاعر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور معمر کہ کر بلا کے عظیم رہنما کی حمایت اور ان کی مخالفت میں اُٹھنے والی آوازوں سے نفرت کرتے ہوئے حریت فکر اور زندہ ضمیر کی کا ثبوت دیتے آرہے ہیں۔ حریت کا پیشوا امام حسینؑ ہیں اور ظلمت پرستوں کا سربراہ یزید ہے۔ ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فاسق و فاجر کی بیعت سے انکار کی جرأت کرنے والی عظیم شخصیت اور تاریخ کے بارے میں پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی یہ ادبی روایت ہے اور اس میں ادیب کا کردار پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک جاری ہے۔ پہلی صدی ہجری میں جب ملوکیت نے خلافت راشدہ کو جاہلیتِ خالصہ بنا کر رکھ دیا تو حضرت حسینؑ نے اس جاہلیتِ خالصہ کے ہاتھ بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ بیعت سے انکار کرنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کے لیے کفر کے فتوے لیے گئے" (۷)

ظلم کی مخالفت کرتے ہوئے مال و جان قربان کر کے کلمہ حق بلند کرنے والی عظیم ہستی اور بیعتِ فاسق کی مذمت میں شعر اشعر لکھتے آرہے ہیں۔ حق کو ظاہری موت آنے کے بعد بھی زندہ و جاوید ہونے، اور اسلام کی حفاظت اور اس دین کو بچانے کی خاطر امام حسینؑ کی دی ہوئی قربانی اور اس معمر کے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر نے لکھا ہے:

قتل حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کر بلا کے بعد

(مولانا محمد علی جوہر)

احمد فراز نے بھی اپنے کلام میں درسِ حریت و آزادی کو کربلا سے لینے کا دعویٰ کرتے ہوئے امام حسینؑ کے ظلم کے خلاف ڈٹے رہنے کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس تاریخی واقعہ سے متاثر ہو کر کہا ہے کہ حریتِ فکر و عمل کے ہمراہ استبداد کا مقابلہ کرنا ہر باضمیر انسان کا شیوہ رہا ہے۔ انہوں نے امام حسین کے حوالے سے کئی منظوم سلام اور نظمیں لکھی ہیں ان میں سے ایک "سید الشہدا" کے نام سے ہے۔ انہوں نے اس جذبے کا اظہار کیا ہے کہ زمانے میں ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھا کر حسینی کردار کی تقلید کریں تو ظلم کا خاتمہ کرنا ممکن ہے اور باطل اور استبداد کے عناصر کو نکیل ڈال کر عظمتِ انسان کی بالادستی قائم کی جاسکتی ہے۔ یزیدی فکر اور باطل سوچ کے بتوں کو پاش پاش کر کے حریت کا علم بلند کرنے کی راہ صرف اور صرف حسینیؑ راہ ہے۔ وہ ہر وقت امیرانِ وقت اور جابر بادشاہوں کی مخالفت میں صبر و استقامت سے کام لینے کی تلقین کرتے رہے۔ وہ اس کاوش و استقامت کے حسنِ انجام، اور فتح و نصرت پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے صرف باطل کی شکست اور حق کی فتحِ یابی کی طرف اشارہ نہیں کیا بلکہ لوگوں کو دعوتِ فکر بھی دی اور ایک بامقصد زندگی گزارنے اور بامقصد فکر کی خاطر قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرنے کی بات کی ہے۔ ظالموں کی ظاہری قوت و مسند کو بلبے اور حباب کی مانند قرار دیا ہے کیونکہ حباب کا وجود بہت کمزور ہوتا ہے۔ چند لمحوں کے لیے وجود پانے کے بعد خود بخود فنا ہو جاتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں حق بقا و دوام حاصل کرتا ہے۔

اور وہ آگ و ظلمت و ستم کے پرچم
تیرے ایثار ترے عزم سے شرمندہ ہوئے
جرات و شوق و صداقت کی توارتخ کے باب
تری عظمت، ترے کردار سے تابندہ ہوئے
ہو گیا نذرِ فنا دبدبہ شمر و یزید
کشتگانِ رہِ حق مر کے مگر زندہ ہوئے
(شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۶۶۵)

اس نظم میں انہوں نے بیعتِ سلطان سے بغاوت کرنے اور جابر و ظالم حکمرانوں کے سامنے گردن نہ جھکانے کا جو درس دیا ہے وہ اس عظیم انقلابی تحریک سے جنم لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محبوب ظفر لکھتے ہیں۔

"کربلا فراز کے ہاں ظلم و جبر کے آگے نہ جھکنے کا نام ہے۔ ایک جدوجہد ہے، ایک فیصلہ ہے، ظلم کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے کا۔ وہ جو کائنات کے امین اور وارث ہیں، فرازا نہیں عقیدت کا مرکز مانتا ہے اور اس کا قلم انہی ہستیوں کے حضور سر بسجود ہوتا ہے" (۸)

ان کی شاعری میں امام حسینؑ کی تقلید میں استبداد سے نفرت اور بادشاہت کی بیعت سے انکار کے رنگ وغیرہ دیکھتے ہوئے اس مزاحمتی رویے اور رجحان کے بارے میں غلام شبیر رانا لکھتے ہیں:

"انہوں نے نہ صرف فسطائی جبر کے خلاف مزاحمت کی بلکہ ظالم پر لعنت بھیجنا اپنا نصب العین سمجھا۔ حضرت امام حسینؑ نے میدان کربلا میں جو فقید المثال قربانی دی اس نے قیامت تک کے لیے استبداد کو بیخ دین سے اکھاڑ پھینکا۔ احمد فراز کی شاعری میں نواسہ رسولؐ حضرت امام حسینؑ کی قربانی کو کلیدی اہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ اس عظیم قربانی نے قسمت بدل دی اور قیامت تک کے لیے حریت فکر کے مجاہدوں کے لیے لائحہ عمل کا یقین کر دیا۔" (۹)

فراز کے اس عظیم سانحہ سے متاثر ہونے اور نظام زندگی کے اصولوں کو اس نظریہ و فکر یعنی کربلا سے لینے اور حق کی بات سولی و نوک نیز پر بھی کرنے کی تاریخ کے حوالے سے فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

"۔۔۔ وہ دشت کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی عظیم قربانی کو انسانی تاریخ کا ایک زریں باب ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسے دورِ حاضر میں حق و باطل کی جنگ میں حق کی سپاہ کا سب سے بڑا سرچشمہ فیضان قرار دیتے ہیں۔ نظم "سید الشہداء" کے آخری بند اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔"

دل کہ ہر سال ترے غم میں لہو روتے ہیں
یہ اسی عہد جنوں کیش کی تجدید تو ہے
جان بکف حلقہ اعدا میں جو دیوانے ہیں
اُن کا مذہب ترے کردار کی تقلید تو ہے
جب سے اب تک اسی زنجیر وفا کا رشتہ
بیعتِ دستِ جفا کار کی تردید تو ہے" (۱۰)

انہوں نے رزمِ حق و باطل کے تسلسل کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ آج بھی باقیاتِ شمر و یزید اپنی سازشوں میں مگن ہیں لیکن حق سے خائف ہیں کیونکہ سچ اور حق اپنی جان کی پروا کیے بغیر باطل قوتوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے ہر لمحہ تیار ہوتا ہے۔

آج پھر مدِّ مقابل ہیں کئی شمر و یزید
صدق نے جن کو مٹانے کی قسم کھائی ہے
(شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۶۶۱)

ج۔ مذہبی طبقے کی طرف سے احمد فراز پر کفر و الحاد کا الزام

احمد فراز کے بعض اشعار و بیانات کی وجہ سے علم سے محروم چند ملاؤں نے ان پر کفر کا الزام لگایا تھا۔ انہوں نے اس بات کی شدید نفی کی کہ نہ میں ملحد ہوں اور نہ ہی کافر بلکہ ان کا کہنا تھا کہ یہ تہمت کسی مولوی نے ذاتی عناد اور اپنی شہرت کے لیے لگائی تھی۔ وہ دوسرے آئمہ مساجد اور علماء حق سے بھی اس بات پر شاکر رہے کہ انہوں نے بغیر تحقیق کے کسی پر کفر و الحاد کی تہمت و الزام کی خبر کو قبول کر لیا۔ احمد فراز علماء حق کا احترام کرتے تھے لیکن ان کی جنگ صرف اور صرف ملاؤں سے تھی۔

انہوں نے اپنے اوپر لگنے والے الزامات کو علامہ محمد اقبال کی حیات و تاریخ کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے اس بات کو دہرایا ہے کہ مفکرِ پاکستان جیسی شخصیت کے خلاف بھی ملاؤں نے کفر کا فتویٰ دیا تھا۔

اک تو ہی نہ تھا جس پہ لگی کفر کی تہمت
ہم جیسے شہیدانِ ستم اب بھی وہی ہیں
یہ فتویٰ فروشی و تہی آغوش و عبا پوش
پیران و فقیہانِ حرم اب بھی وہی ہیں
(نابینا شہر میں آئینہ، ص ۱۰۶)

احمد فراز پر کفر و الحاد کے الزامات لگنے کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اگر نیم خواندہ ملا اور مفتیانِ دین سے بحث و تکرار کی جائے یا ان کی رائے کو رد کر دیا جائے تو وہ اپنی متشدد ذہنیت کی وجہ سے ہر ایک پر کفر و غیرہ کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ یقیناً وہ بھی اس مرحلے سے گزرے ہوں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان

کے کچھ اشعار کو بنیاد بنا کر مذہبی طبقوں نے ان کی مذمت کی اور ان کے خلاف باتیں کیں، اس میں ان کی نظم 'ناموجود' شامل ہے۔ دوسرا نکتہ یہ کہ احمد فراز کا اندازِ بیان اور لہجہ مذہبی طبقے کے بارے میں ترش ہوتا تھا جیسے

شیوخِ شہر سے کیا بحث جو گرہ میں فقط

دو حرف عقد و سہ حرف طلاق رکھتے ہیں

(شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۱۷۵)

تیسری وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایسے بیانات دیے جن کی بنیاد پر ان پر کفر کی تہمت لگی۔ ان کے ان خطرناک اور بے باکانہ بیانات کے بارے میں کشور ناہید لکھتی ہیں:

"فراز آپ میں ایک اور خداداد صلاحیت بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ کو تنازعات کو پیدا کرنے اور ان کو بھارنے میں ملکہ حاصل ہے۔۔۔ ایک مرتبہ آپ نے شادی کے خلاف بھی بیان دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ جسم فروشی کی وہ قسم ہے جو دو فریقین کے درمیان تحریری معاہدے کے تحت عمل میں لائی جاتی ہے۔ اُف میرے خدا آپ کے اس بیان پر ملک بھر میں ایک طوفان برپا ہو گیا تھا۔" (۱۱)

چوتھی اور خاص وجہ ان کا ایک شعر تھا جو بظاہر ایک جسارت اور گستاخی پر مشتمل ہے اور اس بنا پر ان پر کفر والحاد کی تہمت لگی تھی۔ ان کے اس شعر اور اصل حقیقت کے بارے میں ناصر زیدی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر احسن اختر ناز نے اپنے ایک کالم "احساس"۔۔ کے ذیلی عنوان "سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے" کے تحت لکھا "جب وہ اپنے اس شعر کی وجہ سے مذہبی حلقوں میں تنازعہ بنے: اب رسولوں کی کتابیں طاق میں رکھ دو فراز۔۔ نفرتوں کے یہ صحیفے عمر بھر دیکھے گا کون؟ تو انہوں نے خود لفظ "رسولوں" کو کتابت کی غلطی قرار دے کر "اصولوں" میں تبدیل کر دیا، تب یہ اعتراض ختم ہوا "جبکہ ریکارڈ کی درستی کے لیے اصل حقیقت لکھ رہا ہوں کہ جب اس شعر کے حوالے سے پروفیسر کرم حیدری نے وزیر اطلاعات و نشریات سے چغلی کھائی اور شعر اخباروں رسالوں میں مطعون ہوا تو پروفیسر مقصود جعفری اور اس خاکسار نے اس خود فراز صاحب کے حق میں مہم چلائی کہ پروفیسر کرم حیدری چونکہ ثقلِ سماعت کا شکار ہیں اس لیے انہوں نے غلط سنا اور "اصولوں" کو "رسولوں" سمجھے۔ فراز صاحب ان دنوں لندن جا چکے تھے۔ ان

کے خلاف مرتد و کافر اور واجب القتل ہونے کے فتوے دیواروں پر چسپاں کیے جا رہے تھے تاہم وہ واپس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ شعر میں لفظ "رسولوں" کو بدل لیں اور "اصولوں" کر دیں مگر وہ برہم ہو گئے کہ "میں منافق نہیں ہوں کہ جان بخشی کے لیے جھوٹا بہانہ تراشوں، میں نے تو رسولوں ہی کہا ہے" (۱۲)

مفتیانِ دین کے فتوے اپنی جیب میں رکھنے اور لوگوں پر کفر کے فتوے صادر کرنے کے بارے میں فتح محمد ملک کہتے ہیں:

"۔۔۔ اس صوفیانہ روایت سے نا آشنا ذہن میر و غالب سے لے کر فیض و فراز تک شاعری کی تقسیم و تعبیر میں دین و مذہب کے سوال کو ظاہر بین اور دنیا دار ملائیت کے تناظر میں بااعادہ و تکرار اٹھاتا چلا آ رہا ہے۔ مذہب فراموشی اور دین بیزاری یہ اس بیگانگی کا شاخسانہ ہے کہ غالب و میر اور اقبال کے سے درد مند مسلمانوں پر وقتاً فوقتاً اسلام سے بیگانگی سے لے کر کفر تک کے فتوے لگتے رہے۔" (۱۳)

انہوں نے برملا اس بات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب کوئی مجھے ملک دشمن کہتا ہے تو میرا خون کھول اٹھتا ہے اور اسلام دشمنی کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ فراز نے اپنی ایک نظم "میں اکیلا کھڑا ہوں" میں خود کو گناہگار اور عاصی تصور کرتے ہوئے بارگاہِ رسالت میں التماس و التجا کی ہے۔

د۔ مذہبی فکر، غلط تعبیر کے خلاف مزاحمت

ہر سماج میں لوگ کسی نہ کسی مذہب کے پیروکار ہوتے ہیں اور اپنے نظریے اور اصولوں پر عمل کرنا اور اس پر کاربند رہنا لازمی امر سمجھتے ہیں۔ تمام ادیان و مذاہب عالم کی نسبت اعلیٰ و ارفع دین، دینِ اسلام ہے۔ دینِ اسلام کے اصول و ضوابط مضبوط، محکم اور روشن ہیں۔ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے اس کے باوجود مسلم معاشرے میں تشدد، عدم مساوات اور اختلافات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہوں نے مذہبی لوگوں سے اختلاف اور معاشرے میں مذہبی انتہا پسندانہ ذہن رکھنے والوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورت حال کے حوالے سے جو اشعار لکھے ہیں اس کے بارے میں پرتور و ہیلہ لکھتے ہیں کہ:

"فراز کے کلی سرکش مزاحمتی رویے کا ایک ضمنی موضوع مذہبِ ملا، تقدیر اور دین و مذہب کے نام پر جاری کیے اور قائم رکھے گئے توہمات ہیں جس نے ساری قوم

کو بے بسی کی دلدل میں پھنسا رکھا ہے۔ اس کی شاعری کی ایک زیریں اور بڑی مستقل لہر
باشعور و پختہ کار فکر کی ہے جو ان توہمات کے خلاف ابھرتی ہے^(۱۴)

مسلم معاشرے خصوصاً پاکستان میں مسلمانوں کے مابین اختلاف اور عدم برداشت کی صورت حال
اُس وقت سے سامنے آرہی ہے جب سے مذہبی عناصر غیر ذمہ دارانہ طریقے سے مسجد و محراب کو استعمال کرنے
لگے۔ ہمارے معاشرے اور ملک میں آئے روز پُر تشدد واقعات کار و نما ہونا اور عدم برداشت کی کیفیت، مسجد و
محراب سے فلسفہ اسلام اور اس کے اصولوں کی غلط تشریح و تعبیر کرنے والوں کی وجہ سے پیدا ہو رہی
ہے۔ بعض دفعہ تو مذہبی لبادہ اوڑھ کر یہ لوگ ایسی باتیں کر رہے ہوتے ہیں جو اسلامی اقدار کے خلاف ہوتی
ہیں۔ جہل مرکب میں مبتلا ملا اپنے آپ کو بڑا عالم و فاضل شمار کرتے ہوئے اسلام اور اس کے قوانین کی غلط تعبیر
و تشریح کر کے اسلام کی عظمت، اس کے روشن قوانین و احکام اور ہادیانِ برحق کی نعوذ باللہ توہین کرتے نظر
آتے ہیں۔ اس حقیقت اور منظر کو انہوں نے اپنی شاعری میں اس طرح بیان کیا ہے:

مجھے تو ڈر ہے کہ شیخِ حرم کے ہاتھوں
کہیں میری طرح رسوا، رسول و رب بھی نہ ہو
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۸۶۹)

ان کی شاعری میں مذہبی معلومات کے حوالے سے تہی دست ہونے کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ وہ اس بات
کے قائل تھے کہ نبی کریمؐ کی مدح سرائی کے لیے قلم اٹھایا پھر بھی رحمت اللعالمین کے اوصافِ حمیدہ کا ایک ذرہ
بھی بیان کرنے سے قاصر رہا۔ انھوں نے اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریمؐ کی نعت اور خالق
کائنات کی حمد و ثناء لکھنے کی کوشش تو کی ہے لیکن ان کے شایانِ شان ہونا تو دور کی بات ان کی شان کے مطابق
الفاظ جمع کرنے سے بھی قاصر رہا ہوں۔

انہوں نے مسلم معاشرے اور مسلم ریاست کے مذہبی پیشواؤں اور مفتیانِ دین کے افکار پر تنقید کی
ہے۔ ان کا کہنا ہے محل و حرم میں رہنے والے وہاں کی تمام چیزوں اور تاریخوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کے
باوجود شیخِ حرم کی حالت کچھ غیر معتبر ہے۔ شیخِ حرم ظاہری طور پر حرم کا مالک و مختار ہوتا ہے لیکن حرم کی حالت،
تاریخ و آداب سے نا آشنا ہوتا ہے یا صرف نظر کرنا اس کی زندگی کا معمول رہا ہے۔ اس لیے بعض تلخ تاریخی
واقعات شیخِ حرم کی زیرِ نگرانی رونما ہوئے جو کہ کائنات کی عظیم ہستیوں کی شان کے خلاف تھے، یہ ایک نہایت

تعجب آمیز اور فکر طلب بات ہے۔ انہوں نے اسی لیے ان کی فکر اور سوچ کے خلاف لکھا ہے کہ شیخ حرم بظاہر علم و فضل رکھنے کے باوجود اور حرم کے مکین ہوتے ہوئے بھی ایسا رویہ اختیار کرتے اور ایسی باتیں کرتے ہیں جو فرمانِ رسول کی مخالفت پر مشتمل ہوتی ہیں۔

انہوں نے ان مفتیانِ دین اور مذہبی رہنماؤں پر طنز کیا ہے کہ انہوں نے غلط تاویل و تعبیر کرتے ہوئے لوگوں کے افکار خراب کیے ہیں۔ وہ جگہ جو خدا کے سامنے سجدہ ریز ہونے، مساوات و اخوت کی بات کرنے اور ایک فلاحی و اسلامی ریاست و معاشرہ سازی کا مرکز و محور ہے، وہاں سے اخوت و مساوات کا درس اور شعور و فکر دینے کے بجائے انسان دشمن اور اسلام مخالف باتیں اور تقریریں سننے کو مل رہی ہوتی ہیں۔

اللہ کے نام پر بنائی گئی مساجد کو اپنی روزی روٹی کے لیے استعمال کرتے ہوئے مسلکی تعصب کا رنگ بھر کر اس طرح حساس جگہ بنائے رکھتے ہیں کہ دوسرے مسلک و فرقے کے لوگ بھی سجدہ ریز ہونے کے لیے وہاں آنے پر یا تو آمادہ نہیں ہوتے یا خائف نظر آتے ہیں۔ مفتیانِ دین مسلمانوں کو ایک قوم اور ملت بنانے کے بجائے درہم و دینار کے لیے فتویٰ گری میں مشغول نظر آتے ہیں۔

مذہبی طبقہ یعنی علمائے حق جو حقیقت میں انبیاء کے وارث ہیں، ان کا کام اور ذمہ داری بھی نہایت مشکل ہے۔ ان کی شرعی ذمہ داری یہ ہے کہ آفاقی مذہب جو کہ دینِ اسلام ہے اس کے واضح و روشن پیغامات کو دینا تک پہنچا کر لوگوں کی دنیا و آخرت کی فلاح کے لیے رہنمائی کریں۔ علمائے حق کو اس لیے فضیلت دی گئی ہے کہ وہ اسلام کو اچھی طرح جاننے کے بعد اس کے آفاقی پیغام کو دور دور تک پھیلاتے ہوئے تاریکیوں کو اجالوں میں تبدیل کرنے والے ہیں۔ علماء کو چاہیے کہ وہ اہل اسلام کو متحد کر کے کفر کی طاقتوں کے مقابلے میں ایک سیسہ پلائی دیوار کی مانند رہنے کی تلقین کریں اور امن و آشتی کا درس دیں۔ علمائے حق کا تعلق اس طبقہ سے ہوتا ہے جو ہر علمی و عملی میدان میں خود آگے ہوتے ہوئے لوگوں کو اس راہ پر گامزن کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ دور میں بھی کچھ علمائے دین معاشرے میں عدم برداشت اور تعصب کی فضا قائم کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ یہی لوگ اسلام کو غلط رنگ میں پیش کرتے ہوئے اپنی سوچ اور محدود فکر کی بنیاد پر فتویٰ صادر کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنی شاعری میں ان فتویٰ فروش، مذہبی لباس میں ملبوس مسند امامت پر براجمان ہو کر قرآن و احادیث کی صحیح تشریح و تفسیر کرنے کے بجائے اپنے

نظریے اور فکر کی ترویج کے لیے روایات کو دلیل بنا کر پیش کر کے عوام کو گمراہ کرنے والے علمائے سو کی مخالفت کی ہے۔

وہ پر تشدد ذہن رکھنے والے اور مسلکی تعصب کو ابھارنے والے علماء سے اختلاف رکھتے تھے نیز روح اسلام اور تعلیمات اسلام سے نا آشنا ہو کر صرف اور صرف وسائل زندگی کی خاطر اسلام کی غلط تشریح و توضیح کرنے والے مفتیانِ دین سے بہت نالاں تھے جو درہم و دینار کے سامنے اندھے ہو کر بے گناہ انسانوں کی جان و مال سے کھیلتے ہوئے قتل و غارت گری کر رہے ہوتے ہیں۔

معاشرے میں رونما ہونے والے پر تشدد واقعات، مسلکی اختلاف کی بنیاد پر ہونے والے قتل اور بد امنی انہی مفتیانِ دین کے کارناموں میں سے ایک ہے۔ قرآن مجید کا واضح اعلان ہے کہ ”جس نے ایک انسان کو بچایا تو گویا اس نے تمام انسانیت کو بچایا اور جس نے ایک انسان کا قتل کیا گویا اس نے تمام انسانیت کا قتل کیا“،^(۱۵) اس کے باوجود یہ ملا و مفتی فتویٰ گری کے ذریعے بے قصور لوگوں کو موت کا پروانہ بانٹ کر اپنے پیروکاروں کو غیر اسلامی راہ کی طرف دعوت دینے میں مشغول نظر آتے ہیں۔

وہ مفتیانِ دین کی اسلام کی تعلیمات کی بغیر خلوص تعبیر و تاویل کرنے، قرآن و حدیث کی غلط تشریح کرتے ہوئے حق کا پیغام دینے کے بجائے باطل راہ اور ظلمت کی جانب دعوت دینے پر ان کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”کہ محراب و منبر سے

فتوہ گروفتنہ پرداز دیں

حرف حق بیچتے ہیں

فقیہان مسند نشین

حرص دینار اور درہم میں

تیرے صحیفے کا اک اک ورق بھیجتے ہیں

یہ خلقت کا خوں

اور اپنی جبین کا عرق بیچتے ہیں
(میں اکیلا کھڑا ہوں، شہر سخن آراستہ

ہے، ص ۵۹۰)

ان کی علمائے سُو کے بارے میں معلومات اور ان کے قول و فعل میں تضاد کے خلاف مزاحمت کے
بارے میں ڈاکٹر خالد سہیل لکھتے ہیں:

"فراز یہ جان گیا کہ وہی لوگ جو انسانی مساوات کا درس دیتے ہیں، لوگوں کو راہِ راست
کی تلقین کرتے ہیں، مذہب اور خدا کی باتیں کرتے ہیں جب بات دین و دنیا کی آتی ہے
اور مسئلہ بینک بیلنس کا آتا ہے تو ان کے اعمال میں منافقت کے رنگ اُبھرتے ہیں اور وہ
غریبوں کا درد طاق نسیاں یہ دُکھ دیتے ہیں۔" (۱۶)

وہ ہر وقت مذہب کو ڈھال بنا کر طاقت و مسند اور دولت پر قبضہ کرنے والوں کی مخالفت کرتے رہے اور
اسلام کو غلط انداز میں پیش کر کے دام وصول کرنے والوں کو دین فروش اور تاجرانِ مذہب قرار دیا۔ مذہب کی
غلط تشریح کرنے والے تاجرانِ دین دونوں ہاتھوں سے سادہ لوح عوام کو لوٹے چلے آرہے ہیں۔ ایک طرف
جاہل عوام کو مذہبی جنونیت کے دلدل میں پھنسا کر ان سے داد، مراعات اور شہرت حاصل کر لیتے ہیں جبکہ
دوسری طرف سے اسلام دُشمن عناصر کا آلہ کار بن کر ان کی سازش اور پالیسی پر کام کرتے ہوئے اسلام کو
نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان لوگوں کی مذہبی تجارت اور اسلام دشمنوں کے رفیقِ کار بننے پر ان کی مذمت کرتے
ہوئے اس طرح لکھا ہے:

مذہب کو مدام بیچتے ہیں یہ لوگ
ایمان تو عام بیچتے ہیں یہ لوگ
جنت کے اجارہ دار بن کر شب و روز
اللہ کا نام بیچتے ہیں یہ لوگ
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۲۸)

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ انہی علمائے سُو اور مفتیانِ دین کی مذہبی جنونیت، غلط فکر اور غلط تبلیغ
کرنے کی بنا پر امن و آتش اور سلامتی پر مشتمل دین، دینِ اسلام کو عالمی سطح پر قتل و غارت کرنے والا مذہب

تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بات اور صورت حال فلسفہ اسلام کے عین مخالف ہے۔ انہی مذہبی جنونیت رکھنے والے ملاؤں اور دین فروشوں کی وجہ سے مسلمانوں کو ہر جگہ ہزیمت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو جنت کے پروانے اور ضمانتیں دیتے ہوئے لوگوں کی جان و مال سے کھیلتے رہتے ہیں۔

ملاکی دین کی غلط تعبیر سے معاشرے میں بہت ساری خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جیسے لوگوں کا ذرا سی بات پر مذہب کے نام پر قتل و فساد برپا کرنا، مسلکی اختلاف کے باوجود معاشرے میں مل جل کر بیٹھنے والوں کا باہم دست و گریباں ہونا اور عدم برداشت کا ماحول قائم کر کے اپنا تسلط قائم کرنا وغیرہ۔ اس گروہ کے مذہب کے نام پر غلط فائدہ اٹھانے کے حوالے سے ایم اے چوہدری کی بات نہایت تشویشناک ہے۔ وہ سول محکموں کے اعلیٰ آفیسر رہ چکے ہیں۔ ایک انٹرویو کے دوران انہوں نے بتایا کہ جب بھی مذہبی انتہا پسندانہ فکر رکھنے والوں کے خلاف کارروائی کی جاتی ہے تو یہ لوگ کارروائی کرنے والوں پر مذہبی سطح پر جھوٹی تہمت لگا کر ماحول کو ایک پر تشدد ماحول میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ دین اور سیاست جدا نہیں ہیں، لیکن مذہبی رہنما سیاست جو کہ صرف حصول اقتدار کا ذریعہ ہوتی ہے کے لیے مذہب کا نام استعمال کرتے آرہے ہیں۔ اس کی مثال عباس عالم کی تحریروں سے ملتی ہے وہ لکھتے ہیں:

"امیر جماعت اسلامی کے میاں طفیل نے چیچہ وطنی کے جلسہ میں تقریر کے دوران یہ فتویٰ جاری کر دیا کہ قومی اتحاد کے حق میں استعمال ہونے والا ووٹ ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔" (۱۷)

یہ بات سچ ہے کہ علمائے حق کی محفل ہر وقت علمی گفتگو اور امن و بھائی چارے پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان کی محفل میں علمی و فکری ترقی کی مفید باتیں ہوتی ہیں۔ جبکہ علمائے سو کی محافل میں لوگوں کو بہکا یا جاتا ہے اسی لیے فراز نے اپنی شاعری میں ان محفلوں کی تفاوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

فقیہ شہر کی مجلس سے کچھ بھلا نہ ہوا

کہ اُس سے مل کے مزاج اور کافرانہ ہوا

(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۴۵۱)

ایک دفعہ احمد فراز کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ جس کے ضمن میں مذہبی لوگوں کی ذہنیت کو دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے مذہبی طبقے مصر کے عبدالجمال ناصر کی حمایت میں مجاہدین کو جہاد کے لیے لے جا

رہے تھے۔ اتفاق سے احمد فراز کا بھائی بھی اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ وہ اپنے بھائی کو واپس بلانے کے لیے اس مذہبی رہنما اور ذمہ دار اور متحرک شخص کے پاس پہنچے اور ان سے اپنے بھائی کو واپس بھیجنے کی بات کی لیکن علامہ نے ان کی بات نہیں مانی۔ انہوں نے کہا کہ میرا بھائی نابالغ بھی ہے اور وہ والدین کی اجازت کے بغیر آیا ہے۔ ان کے مابین کا تکرار ہوئی۔ اس تکرار کے دوران علامہ نے کہا کہ جہاد کے لیے نہ بالغ ہونا شرط ہے اور نہ ہی والدین کی اجازت ضروری ہے۔

ہ۔ مذہبی اجارہ دار طبقے کے استحصالی رویوں کے خلاف مزاحمت

دھکتی دھوپ میں خلقت تھی گوش بر آواز

بجز خطیب مگر کوئی سناں میں نہ تھا

(ناینا شہر میں آئینہ، ص ۴۱)

احمد فراز ہر وقت سیاسی اور سماجی سطح پر لوگوں کے حقوق سلب کرنے والے استحصالی عناصر کے خلاف بولتے اور لکھتے رہے۔ ہر سماج میں ظلم و استبداد اور استحصالی کی کوئی نہ کوئی روایت یا واقعہ ضرور ملتا ہے لیکن نہایت تعجب آمیز اور قیامت خیز مرحلہ یہ ہے کہ استحصالی کرنے والے عناصر میں مذہبی طبقے بھی ملوث نظر آتے ہیں۔ مفتیان و علمائے دین لوگوں کو ہر وقت اور ہر لحظہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری، ظلم کی راہ کو انتخاب کرنے سے احتراز کے بارے میں بے شمار آیات و احادیث سناتے رہتے ہیں لیکن جب عمل کو دیکھا جائے تو یہ خود لوگوں کا استحصالی کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں علمائے سوا اور مفتیان دین کی اس روش سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ملا عدل و انصاف اور ظلم کے موضوع پر تقریر و تبلیغ تو کرتے ہیں لیکن جب عدل و ظلم کے مابین کشمکش کی بات آتی ہے تو مفاد کی دلدل میں پھنس کر ان میں حق و باطل کی تمیز نہیں رہتی۔

معاشرے کو ناہمواری کی جانب لے جانے اور نا انصافی کو عام کرنے میں صرف اہل سیاست و ثروت کا ہی نہیں بلکہ اہل مذہب کا بھی اچھا خاصا کردار ہوتا ہے۔ ملک میں انصاف کے فقدان پر تشدد ماحول اور استحصالی عناصر کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد سہیل لکھتے ہیں:

"وہ گروہ جو انصاف کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اہل

ثروت، اہل سیاست اور اہل مذہب اور یہ تینوں گروہ دولت، حکومت، اور خدا کا نام لے

کرایک غیر منصفانہ نظام کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ فراز اپنی شاعری میں ان گروہوں کی نشاندہی کرتا ہے۔" (۱۸)

فقیہ شہر جہیں پر گلاہ زر رکھے
سنا رہا ہے ہمیں آیتیں مقدر کی
(نایافت، ص ۵۵)

اہل خیر و شر یعنی اہل حق و باطل کی پہچان یہ ہے کہ حق کی حمایت کرنے والے علما کسی دربار کے مراعات یافتہ نہیں ہوتے۔ احکام دین اور حکم خداوندی کے پابند ہوتے ہیں۔ دین اسلام کی باتوں کو ڈالرو دینار کی لالچ اور ہوس سے ماوریٰ ہو کر خالصتاً خدا کی خاطر اور اپنی شرعی و عملی ذمہ داری سمجھتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں علمائے سول یعنی فتویٰ فروش مفتیان ہر وقت دربار کے دربانوں کی طرح آقا کے حکم کے تعمیل کرتے ہوئے وقتی شہرت اور دولت کمانے کے درپے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مردہ ضمیری کے سبب ظالموں کی صفوں اور مجلسوں میں بھاگ دوڑ کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہی لوگ حاکم وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ان کی حمایت میں تقریریں کرتے ہیں اور خلوت میں عالمی استکبار کے اشاروں اور مشوروں پر من و عن عمل کر کے اپنی جیب ڈالرو دینار سے بھر دیتے ہیں۔ یہی ملا مسجد و منبر کی حرمت کا خیال کیے بغیر اپنی زبان تک کی طہارت کو ختم کر کے جابر و جرائم پیشہ عناصر کے ہم نشین بن جاتے ہیں۔ فراز ان کی اس روش کو قابل مذمت سمجھتے تھے۔ حقیقی معنوں میں اگر دیکھا جائے تو مذہبی رہنماؤں کی اہم ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ وہ ظالم و جابر حکمرانوں کے خلاف صدائے حق بلند کرتے ہوئے ان سے بغاوت کا اعلان کریں۔ لوگوں کو ان باطل قوتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا شعور دیں اور ان ظالموں کو مسند سے گرا کر عادلانہ اور منصفانہ حکومت کے قیام کے لیے اسباب پیدا کریں۔

چند سکوں اور جزوقتی مراعات کی خاطر دربار سے وابستگی اختیار کر کے بعض مذہبی رہنما ظالم کو محسن اور عادل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ چند کوڑیوں کے عوض اپنی عزت و ضمیر اور شخصیت کو نیلام کر کے عوام کے ذہنوں کو بھی ظالموں کے کردار و عمل کی طرف راغب کر کے زنگ آلود کرنے کی کوشش کرتے نہیں تھکتے۔ علمائے سومعاشرے میں بااثر ہونے اور اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اپنا رشتہ اور تعلق اسلام کے ساتھ جوڑنے کے بجائے امیرانِ وقت سے مضبوط کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ بادشاہانِ وقت کی درباری کو

سعادت سمجھتے ہوئے ان کے ہر حکم پر گردن جھکا کر غلامی قبول کرنے والے مذہبی لوگوں کے بارے میں انہوں نے اس انداز میں لکھا ہے:

دربار سے وہ رشتہ رہا مفتی دین کا
منبر سے ہر ارشاد پہ آمین ہوئی ہے
(نابینا شہر میں آئینہ، ص ۱۰۴)

حکمران طبقہ اور سرمایہ دار طبقہ مذہبی لوگوں کو اپنے مقاصد و سیاست کے لیے استعمال کرتا ہے۔ انہیں درہم و دینار کی چمک دکھا کر ان پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہر وقت تیار رکھتے ہیں۔ لوگوں کے حقوق سلب ہونے اور معاشرے میں نا انصافی کا رواج عام ہونے میں مذہبی افراد بالواسطہ شریک ہوتے ہیں۔ اسی لیے اپنی شاعری کے ذریعے فراز نے ہر گام ان کی مذمت کی ہے۔ مفتیانِ کرام کے حکمرانوں، سرمایہ داروں اور نادیدہ قوتوں کا آلہ کار بننے اور احمد فراز کے اپنی شاعری میں ان سے بیزاری کے اظہار کے حوالے سے ثاقب رزمی لکھتے ہیں:

"جہاں تک سیاست کا تعلق ہے استحصال پسند مذہبی، پیشوائیت بالعموم بادشاہوں کی پروردہ رہی ہے اور اب بھی ہے۔ اس لیے وہ بادشاہوں، آمروں، جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کا ساتھ دیتی ہے۔۔۔ فراز اپنے اشعار میں ان عالم گریسی حقائق کو بڑی عالمانہ سطح پر پیش کرتا ہے۔" (۱۹)

خدا کا نام جہاں بیچتے ہیں لوگ فراز
بصد وثوق وہاں کاروبار چلتے ہیں
(شہر و سخن آراستہ ہے، ص ۱۲۰)

پوری دنیا اور خصوصاً مسلم ممالک میں رونما ہونے والے فسادات اور خون خرابے کی وجوہات میں ایک بڑی وجہ سیم و زر ہے۔ بعض مذہبی پیشوا اور رہنما بھی اس فساد میں صفِ اول کے فساد یوں میں شامل نظر آتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے ان مذہبی پیشواؤں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ شام و سحر صبر و تحمل اور قناعت کے بارے میں وعظ و نصیحت کرنے اور خود داری کی حفاظت کا درس دینے والے مذہبی افراد خدا کا نام استعمال کرتے ہوئے لوٹ مار کرنے والوں کے حصہ دار بنے ہوتے ہیں۔ ان مذہبی لوگوں کو اس بات کی ہر گز پروا نہیں کہ اس سے

لوگوں کا کتنا نقصان ہوتا ہو گا اور لوگ کتنی مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ یہی مذہبی اجارہ دار طبقہ نسل در نسل اللہ کا نام استعمال کر کے مذہب کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے لوگوں کے مذہبی جذبات و احساسات سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہوتے ہیں۔

احمد فراز نے مذہبی گروہ کی مذمت و مخالفت اسی لیے کی تھی کہ یہ خدا اور مذہب کے نام پر دولت اور جائیداد بنانے والے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ راتوں رات امیر بنتا ہے اور دین کی تجارت ان کے لیے ایک سود مند کاروبار کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دولت اکٹھی کرنے کا ایک انتہائی منافع بخش طریقہ ہے۔ یہی لوگ پیسے کی خاطر مذہب کو استعمال کر کے کہیں جہاد اور کہیں مسلک و فرقہ اور کہیں نسلی و لسانی تعصب کی آگ کو بھڑکا کر عوام کی زندگیوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں اس سے بڑا استحصال کیا ہو سکتا ہے۔؟

یہ بات ہماری تاریخ کا اہم حصہ ہے کہ مذہبی رہنماؤں کو سب سے زیادہ ضیاء الحق نے استعمال کیا۔ افغان جہاد کے نام پر ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کی تبلیغ و ترویج میں مفتیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انتہائی غلط اور مضر قدم اٹھا کر ماحول کو اس قدر خوفناک کر دیا کہ اس وقت سے لے کر آج تک ملک کو منفی و مضر نتائج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

مذہب کے نام کو استعمال کرتے ہوئے عوام اور خصوصاً نوجوان طبقے کو مذہبی جنونیت میں گرفتار کر کے جہادی اور خود کش حملہ آور بنانے میں بڑا رول مفتی اور ملا ہی ادا کر رہے ہیں۔ ان کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ ان کے اس مکروہ اور غلط فلسفہ و نظریہ کی وجہ سے نہ جانے کتنے والدین بے آسراء کتنے بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں۔

مذہبی اجارہ دار طبقے کے استحصال کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ عناصر مذہب کا نام استعمال کر کے لوگوں خاص کر نوجوانوں کو جہادی اور خود کش حملہ آور بنادیتے ہیں۔ اپنی غلط سوچ، فکر اور عزائم کی تکمیل کے لیے آیات و احادیث کی غلط تشریح بیان کر کے کر کے ہر دہلیز اور گلی کو چوں میں موت کے پروانے تقسیم کر کے نادم ہونے کے بجائے نازاں و رقصاں نظر آتے ہیں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کارِ خیر میں نہ خود ملا و مفتی مجاہدین کی صف میں مجاہد بن کر کھڑے نظر آتے ہیں نہ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کی کوئی اولاد اس تحریک کا حصہ بنتی نظر آتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کارِ ثواب کو حاصل کرنے کے لیے یا تو وہ خود پیش پیش ہوں یا ان کی کوئی اولاد اس ثواب کے حصول کے لیے ہر وقت تیار ہو۔ لیکن اس طرح کے آثار کو سوں دور

تک بھی نظر نہیں آتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مسجد و محراب میں پیسوں کے لیے تند و تیز تقریر کر کے مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کی سوچ رکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کر کے ملک کو بد امنی و بد حالی کی طرف دھکیل رہے ہوتے ہیں۔ اسلام کے ٹھیکیداروں کے اس مذموم کردار کی بنیاد پر دوسرے شعرا کی طرح فراز نے بھی تنقید کی ہے۔ یہ لوگ دوسروں کے بچوں کو خود کش حملہ آور بننے کی تربیت دیتے ہوئے دوسرے بے گناہوں کی زندگیوں سے کھیلنے پر اکساتے ہیں لیکن اپنی اولاد کو اس طرح کی ہوا تک لگنے نہیں دیتے۔ ملا، مفتی اور ان کی اولاد نہایت آسودگی کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوتی ہے، اچھی خاصی جائیداد بیک بیلنس بنا لیتے ہیں اور ان کے آقاؤں کے بچے تو مغربی ممالک کی آسودہ فضاؤں میں پر تعیش زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہوتے ہیں لیکن غریب عوام کے بچے مذہبی جنونیت کی بھیٹ چڑھتے نظر آتے ہیں۔ اس سے بڑا استحصال کیا ہو سکتا ہے؟

احمد فراز عالمی سطح پر مذہبی رہنماؤں اور مسلم حکمرانوں کی مجرمانہ خاموشی اور مغربی آقاؤں کے غلام اور آلہ کار بن کر اپنے ہی لوگوں کے مالی، سیاسی اور مذہبی استحصال کرنے پر بھی چپ نہیں رہے۔ انہوں نے ان مسلم حکمرانوں اور مذہبی رہنماؤں پر کڑی تنقید کی ہے۔ آج بھی مذہبی پیشوا مغربی طاقتوں کے آلہ کار بن کر ہر جگہ خون خرابہ کرانے میں مصروف ہیں اور آئے روز ہزاروں مسلمان ان کی بھیٹ چڑھ رہے ہیں۔ فلسطین، شام، افغانستان، انڈونیشیا، عراق اور یمن میں لاکھوں مسلمان لقمہ اجل بن رہے ہیں۔ اس کے باوجود مذہبی رہنماؤں سے مس نہیں ہیں۔

ان کی مجرمانہ خاموشی اور جرأت و شجاعت کے فقدان پر طنز کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

محل سراؤں میں خوش مقدر شیوخ چپ

حرم کے پاسباں

عالم پناہ چپ ہیں

منافقوں کے گروہ کے سربراہ چپ ہیں

تمام اہل ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے

لا الہ چپ ہیں

(بیروت، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۰۲۴)

فراز کے مسلمانوں کی قومی و ملی غیرت و حمیت کو بالائے طاق رکھ کر دوسروں کے مفاد کی جنگ میں کود جانے اور مغربی سازشوں کے جال میں پھنسنے والوں پر تنقید کرنے اور ان سے نالاں ہونے کے بارے میں ثاقب رزمی لکھتے ہیں:

"یہ ایک کرناک حقیقت ہے کہ آج تمام بلادِ اسلامیہ کے حکمران طبقے غیرتِ ملی اور خود شناسی کو بھول کر جدید نوآبادیاتی نظام کے ساحر مطلق کے محکوم بن چکے ہیں۔۔۔ فراز نے تیسری دنیا کے مسلمان حکمرانوں کی اس ضمیر فروشی اور شکست خوردگی اور حضرت امام حسین کی عظمت شہادت کو دین میں رکھ کر صیغہ متکلم میں کیا ہے، میں آج اس کر بلا میں بے آبرو و نگوں سر شکست خوردہ نجل کھڑا ہوں" (۲۰)

ظالموں اور جابروں کی حمایت میں فتویٰ دینے والے فتویٰ فروشوں کے منبر اور مسندِ امامت پر براجمان ہو کر عوام کو گمراہ کرنے والوں کی چرب زبانی وغیرہ کو دیکھ کر وہ اپنی شاعری میں منبر کو صلیب سے تعبیر کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سلسلہ برسوں سے چلا آ رہا ہے کہ صلیبوں پر بھی مجرم کو لٹکانے کے بجائے حکمرانوں کے اشاروں پر مظلوم و محکوم کو ہی لٹکایا جاتا رہے۔ منبر و محراب سے حق و مظلوم کی حمایت میں آواز اٹھنے کے بجائے باطل و ظالم کی حمایت میں تقریریں ہوتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے محراب و منبر کو صلیب سے عبارت کیا ہے۔ اہل منبر اور خطیبِ شہر حکمرانوں اور ثروت مندوں کے حق میں نہ صرف بولتے ہیں بلکہ ان کے دست راست بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس منظر کو انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے۔

یہ راز نعرہ منصور ہی سے ہم پہ کھلا
کہ چوب منبر مسجدِ صلیبِ شہر بھی ہے
کڑی ہے جنگ کہ اب کے مقابلے میں فراز
امیرِ شہر بھی ہے اور خطیبِ شہر بھی ہے
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۹۰۰)

ملک و معاشرے میں سرعام لوگوں کا استحصال اُس وقت ہوتا ہے کہ جب امیرِ شہر اپنے تمام ناجائز اور غیر اسلامی کاموں کو اسلامی رنگ دینے کے لیے خطیبِ شہر سے مدد لیتے ہوئے ان پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا

ہے، جب ان کو وسائلِ حیات کی فراوانی کا فریب دیتا ہے تب یہ طبقہ اس کی نصرت و تائید پر بلا تامل فصاحت و بلاغت سے بھری تقاریر کرتا ہے اور انہیں لوگوں کے سامنے نیک اور اعلیٰ اخلاق کا حامل بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

فراز کی حکومت میں شامل کچھ مذہبی لوگوں سے معاصرانہ چشمک بھی رہی ہے۔ مزید برآں ان کو ان مذہبی لوگوں کی زیر نگرانی کام کرنا پڑا، اس کے باوجود وہ اپنی ضد اور آنا پر قائم رہے۔ انہوں نے شخصی مخالفت و حسد اور عداوت کی بنیاد پر بھی مذہبی لوگوں کے خلاف اشعار لکھے۔ انفرادی طور پر بھی مذہبی شخصیات کو ہدف تنقید بنایا۔

قاتل اس شہر کا جب بانٹ رہا تھا منصب
ایک درویش بھی دیکھا اُسی دربار کے بیچ
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۸۶۶)

انہوں نے شدت کے ساتھ مذہبی رہنماؤں کی مذمت کی ہے لیکن کہیں کہیں وہ مذہبی لوگوں سے مرعوب ہوتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات مصلحت پسندی کا شکار ہونے یا نرم گوشہ رکھنے کا شائبہ بھی ہوتا ہے۔ اس کی واضح مثال اور ثبوت یہ ہے کہ فراز جب نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سربراہ تھے اُس وقت لائبریری کے لیے سرکاری سطح پر زمین الاٹ کرائی گئی تھی اس پر چند مولوی صاحبان نے قبضہ کر لیا۔ انہوں نے نہ اُن مولویوں کے خلاف کہیں کوئی کیس و مقدمہ لڑا اور نہ ہی کہیں اس واقعے کا برملا اظہار کیا، اور اگر کسی جگہ اس کا ذکر بھی کیا تو مبہم انداز میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ "ہم نے پیسے دے دیے۔ زمین ٹرانسفر ہو گئی، لیکن دیکھا گیا کہ وہاں قناتیں لگا کر مسجد کی تعمیر شروع کر دی گئی، لیکن نہ ہم لڑ سکے نہ انتظامیہ کچھ کر سکی"۔ اس واقعے کی حقیقت اور فراز کے اس قبضے کے خلاف مقدمہ کیے بغیر دوسری مرتبہ گورنمنٹ کی سطح پر بات کر کے کہیں اور زمین حاصل کرنے کے حوالے سے منشا یاد لکھتے ہیں:

"سی ڈی اے نے نیشنل بک فاؤنڈیشن کے نام "آتھر ز کارنر" کے نام سے ایک پلاٹ
الاٹ کر رکھا تھا جس پر لال مسجد والوں نے قبضہ کر لیا تو احمد فراز ہی کی کوششوں سے ایف
سیون مرکز میں اس کا متبادل پلاٹ الاٹ ہوا۔" (۲۱)

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی زمین پر مولویوں کے قبضہ کر کے مسجد بنانے کے منظر کو اس انداز میں بیان کیا ہے:

اے شیخ یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تو نہیں ہے
تعمیر خرابات ہے تعمیر خرابات
(اے عشق جنوں پیشہ، ص ۹۹)

جب کہ خود فراز پر کسی نے کرپشن کا الزام لگایا تو وہ ایک بہترین وکیل کے ذریعے مقدمہ لڑنے لگے مگر اسی دوران وفات پا گئے۔

و۔ شعری روایات میں مذہبی کرداروں کے بارے میں رویے

علم و ادب کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ قدیم دور میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم بلا امتیاز تمام مراکزِ علوم میں دی جاتی تھی۔ جب مسلمان زبوں حالی کا شکار ہوئے تو ان پر ظلم و ستم کا آغاز ہوا، مسلمانوں کے علمی مراکز کو تہس نہس کر کے لائبریریوں کو آگ لگائی گئی۔ بعض لائبریریوں میں موجود کتابیں جو مسلمانوں کا بہت بڑا اثاثہ تھیں مسلمانوں سے چھین لی گئیں۔ علامہ محمد اقبال نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں کے علمی مراکز کو خاکستر کرنے کے بعد علمائے دینی اور مذہبی علوم کو بچانے کی کوشش کی اور اس علم کو پھیلانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد دوسرے علوم کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں سے علوم کی دو شاخیں سامنے آئیں۔

ہر معاشرے اور سماج میں مذہبی لوگ، ادیب اور شعرا موجود ہوتے ہیں اور فصاحت و بلاغت پر دسترس رکھتے ہیں۔ معاشرے کی فلاح و ترقی اور لوگوں کی خوشحالی کی خواہش رکھنے کے علاوہ یہ لوگ معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں کی نشاندہی بھی کرتے رہتے ہیں۔ مذہبی عناصر، شعرا اور ادبا کے درمیان ہمیشہ سے چپقلش چلی آرہی ہے۔ مذہبی لوگ اپنے آپ کو معاشرے کا مسیحا سمجھتے ہوئے روشن خیال ادیبوں پر رند و کفر اور اسلام سے دوری کا الزام لگا دیتے ہیں اور ان کو معاشرے کے لیے غیر مفید بلکہ معاشرے کی خرابی کا باعث و سبب قرار دیتے ہیں۔ شعرا بھی کبھی ان سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔ وہ بھی اپنے اشعار کے ذریعے مذہبی لوگوں کو فساد، غاصب و ریاکار لوگوں کے حقوق کا استحصال اور عوام کو گمراہ کرنے والوں کا سربراہ قرار دیتے ہیں۔ شعری روایات میں مفتیانِ دین کی گفتگو طرزِ زندگی اور ان کے قول و فعل میں پائے جانے والے تضادات پر شعرِ طنز و تنقید کے نشتر خوب چلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غزل کی دنیا کے بے تاج بادشاہ مرزا اسد اللہ خان غالب کی شاعری میں یہ روایت موجود ہے۔ غالب نے واعظ پر اس طرح طنز کیا ہے کہ واعظ مذہبی آداب و رسوم کو سلیقہ مندی کے ساتھ بیان تو کرتا ہے لیکن اس کا بیان خلوص سے عاری ہے اس لیے اس میں کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ واعظ جب خود عمل نہیں کرتا تو لوگ بھی اس کی باتیں سن کر سن ہو جاتے ہیں اور عمل کی جانب قدم نہیں بڑھاتے۔ واعظ اچھی بات پر نہ خود عمل کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور کو خلوص دل کے ساتھ عمل کی دعوت دے سکتا ہے۔ بقول غالب:

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
(کلیات غالب، ص ۲۲۴)

اسی طرح غالب نے مذہبی لوگوں کے جذبات میں آکر آپے سے باہر ہونے اور ان کے صبر و حوصلہ اور اخلاق پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے۔

نہ لڑنا صح سے غالب، کیا ہوا اگر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر روز چلتا ہے گریبان پر
(کلیات غالب، ص ۵۸)

مفتیانِ دین دوسروں سے معمولی کوتاہی اور غلطی سرزد ہونے پر زمین اور آسمان ایک کر دیتے ہیں اور خود کو پارسائی اور پرہیزگاری کا علم بردار تصور کرتے ہیں۔ غالب نے ان کے ان گزرے ہوئے لمحات و ایام اور دنوں کی پرہیزگاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

کہاں میخانے کا دروازہ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
(کلیات غالب، ص ۲۱۵)

مفکر پاکستان شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے ہاں بھی یہ روایت ملتی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی مذہبی پیشواؤں کی فصاحت و بلاغت سے پُر گفتگو و تقریر سے لوگوں کا دل موم بنانے اور خود سنگِ دل رہنے کے بارے میں طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

مرید سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق
(کلیات اقبال، ص ۲۷۴)

علامہ اقبال نے مذہبی رہنماؤں کے نظریے، عزم و ارادے، ہر گام ہر لمحہ فیصلہ بدلنے اور ان کی گفتگو کا انداز بدلنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برقِ طبعی نہ رہی، شعلہِ مقالی نہ رہی
(جواب شکوہ، کلیات اقبال، ص ۲۳۱)

علامہ اقبال نے محرابِ مسجد میں بیٹھ کر خطبہ و تقریر کرنے والوں اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر اذان دینے والوں، خود کو قلعہ اسلام فتح کرنے والے مجاہد شمار کرنے والوں کو اپنی سوچ اور فکر تبدیل کرنے اور خود اپنی ذات کو سمجھنے پر دھیان دینے کی نصیحت کی ہے اور ان کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ حقیقی محافظِ اسلام اور مجاہد اسلام تو وہ ہے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اسلام کی سر بلندی کے لیے نبرد آزما ہوتے ہوئے میدانِ کارزار میں اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ علامہ محمد اقبال مسجد میں اذان و خطبہ دینے والے مؤذن و خطیب اور میدانِ جنگ میں استقامت و پامردی کے ساتھ دشمن کے مقابلے میں موجود مجاہد کی نیت و خلوص کا تقابل و موازنہ کرتے ہوئے لکھے ہیں:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذان اور ہے مجاہد کی اذان اور
(حال و مقام، کلیات اقبال، ص ۴۸۷)

مذہبی لوگوں کی ریاکاری کے بارے میں علامہ اقبال نے لکھا ہے:
عقلِ عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشقِ بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم
(کلیات اقبال، ص ۳۹۳)

ز۔ احمد فراز کی شاعری میں شعری روایات کی عکاسی

فراز کی شاعری میں بھی یہ روایت کثرت سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ آمریت کے بعد مذہبی لوگوں سے بھی اُلجھتے اور ان پر تنقید کرتے رہے۔ اُنہوں نے واعظوں اور ناصحوں سے اپنی دُوری اور لا تعلقی کا اعلان اس طرح کیا ہے:

واعظ سے فراز اپنی بنی ہے نہ بنے گی
ہم اور طرح کے ہیں جناب اور طرح کے
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۶۵۶)

اُنہوں نے شعر اور مفتیانِ دین کے مابین موازنہ کیا ہے کہ دونوں میں سے حق بات کرنے والا کون ہے؟ ان کا خیال ہے کہ شاعر ہی حق کی حمایت اور ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے والا ہے، جبکہ مفتیانِ دین میں اس طرح کی جرات نہیں پائی جاتی۔ وہ شاعر کی دلیری اور مفتی کی بزدلی اور عدم جرات پر طنز کر کے لکھتے ہیں:

مجھ سا گناہ گار سردار کہہ گیا
واعظ نے جو سخن سرِ منبر نہیں کیا
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۵۶۷)

فراز بعض مذہبی طبقوں کی محفلوں کے غیر مفید ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے مقابلے میں شعر اودا کی مجلس کو بہتر قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ شہر کے فقیہوں کی محفل و اجتماع میں نفرت پھیلانے، فساد برپا کرنے، قتل و غارت کرنے اور کفر کا فتویٰ لگانے کی باتیں ہوتی ہیں جبکہ سر پھرے شعر کی محفل و مجلس میں انسانوں سے محبت کرنے ایک دوسرے سے انسانیت کے رشتے کی بنا پر جڑے رہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ بقول فراز:

فقیہ شہر کی مجلس نہیں کہ دُور رہو
یہ بزمِ پیرِ مغان ہے قریب آجاؤ
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۴۳)

ان کی بدنامی کی وہ باتیں جو لوگ جانتے ہیں۔ وہ خود بھی اس کے قائل ہیں۔ اس سے انہوں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ مذہبی لوگ اپنے آپ کو عابد سمجھتے ہیں۔ اپنے زعم و گمان کے مطابق خود کو بے خطا و پاک باز سمجھتے

ہیں لیکن وہ ان کے اس گمان پر حملہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ اس کا فیصلہ کرنے والا معاشرہ اور ان کے ساتھ نشست و برخاست میں شریک لوگ ہیں۔ انہوں نے ان کی پاکبازی و چالبازی کے بارے میں یوں اظہار کیا ہے:

ہم تو بدنام محبت تھے سو سوا ٹھہرے
ناصحوں کو بھی مگر خلق خدا جانتی ہے
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۱۲۲)

فراز عوامی حلقے میں مقبول و مشہور تھے۔ انہوں نے کئی بار اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ ان کو زیادہ محبت عوام کی طرف ملی ہے وہ عوام کی محبت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ عوام کی محبت کو بڑی دولت سمجھتے تھے۔ فراز نے عوام کی چاہت اور محبت کو معیار قرار دیتے ہوئے مذہبی اجتماعات میں فخر و مباہات اور بلند وبالا آہنگ کے ساتھ جوشِ خطابت میں متکبرانہ انداز اپنانے والے واعظ کی اس بات اور انداز سے اختلاف کرتے ہوئے اسے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مسند و منبر تک رسائی ملنے پر زیادہ مغرور نہ ہو۔ عوام کی طاقت و چاہت ہمیشہ بلاکیش و مسلک شعرا کے ساتھ ہوتی ہے واعظ کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اسی کو معیار فضیلت و طاقت شمار کرتے ہوئے لکھا ہے:

واعظم منبر و مسند پہ نہ اترا اتنا
یہ بتا کیا کسی دل میں ہے جگہ بھی تیری
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۴۱۹)

انہوں نے مذہبی لوگوں کے جابروں اور دولت مندوں سے رسم و راہ رکھنے، ان سے انعام و اکرام کی آس و امید لگائے خائن حکمران کے سامنے دست دراز ہونے اور اپنی گردن جھکانے پر ان پر شدید تنقید کی ہے۔

تمام صوفی و سالک، سبھی شیوخ و امام
امید لطف یہ ایوان کجلاہ میں ہیں
(محاصرہ، شہر سخن آراستہ ہے ۹۱۵)

انہوں نے اپنے قلم کو ریاکاری سے پاک قرار دیتے ہوئے مذہبی رہنماؤں اور حفاظِ قرآن کی ریاکاری کے خلاف بھی ان پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

مرا قلم نہیں تسبیح اُس مبلغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
(محاصرہ، شہر سخن آراستہ ہے، ص ۹۱۷)

رندوں پر تنقید کرنے والے زاہدوں کے کبھی اتفاق سے رندوں کی محفل میں پہنچ کر، رندوں کے ہاتھوں اپنی خاطر تواضع اور خدمت کرانے کے بعد ان کی عادات و اطوار میں یک سوئی نہ رہنے، خلوت و جلوت میں دہرامعیار رکھنے اور اس خدمت گزاری پر رندوں کی ندامت و پشیمانی اور نالاں ہونے کی تصویر کشی انہوں نے اس طرح سے کی ہے:

رندوں نے صدقِ دل سے زاہد کو بھی پلا دی
اب سخت ہیں پشیمیاں کارِ ثواب کر کے
(اے عشقِ جنوں پیشہ، ص ۱۸۷)

فراز نے بعض مذہبی افراد کا ایمان متزلزل ہونے پر طنز کیا ہے اور ان کی یہ بات کافی حد تک سچ دکھائی دیتی ہے۔ آج بھی بعض دین کی تعلیم دینے والے نیم خواندہ ملاقرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مسجد و مدرسہ میں آنے والے بچوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کر جاتے ہیں۔ اس طرح کی خبریں میڈیا کی وساطت سے سامنے آرہی ہوتی ہیں تو کہیں اللہ کے گھر میں اذان و تلاوت کرنے والے حفاظ اور مسجد میں مسند امامت پر جلوہ افروز چند مذہبی شخصیات کے ہاتھوں بنتِ حوا کی عصمت ریزی کی خبریں بھی میڈیا کی زینت بن رہی ہوتی ہیں۔

یہی ناصح جو ہمیں تجھ سے نہ ملنے کو کہیں
تجھ کو دیکھیں تو تجھے دیکھنے آنے لگ جائیں
(شہر سخن آراستہ ہے، ص ۱۶۴۵)

انہوں نے ان کے ایمان پر کڑی تنقید کر کے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان مذہبی جنونیت کی سوچ و فکر رکھنے والوں کو ماحول و موقع نہیں مل رہا ورنہ درحقیقت یہ عام لوگ سے زیادہ جرائم کرنے والے لوگ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شہباز رشید بہورو، اسلام اور دہشت گردی، سچ کیا، جھوٹ کیا؟، www.daleel.pk، ۳ مئی ۲۰۱۸ء،

۲:۰۰pm

۲۔ محبوب ظفر، احمد فراز فن و شخصیت، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۵۰، اشاعت دوم

۳۔ غلام شبیر رانا، ڈاکٹر، احمد فراز مشمولہ احساس ۲، ملاقات پہلی کیشنز پشاور، ص ۷۸

۴۔ زاہد حسن، دنیا تیرے بارے میں میرے خواب بہت ہیں، مشمولہ ماہ نوا احمد فراز نمبر، ادارہ مطبوعات پاکستان

لاہور، شمارہ ۸ جلد ۲۱، جنوری ۲۰۰۹ء، ص ۱۸۸

۵۔ محبوب ظفر، احمد فراز فن و شخصیت، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، اشاعت دوم، ۲۰۱۶ء، ص ۱۵۱

۶۔ فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری، دوست پہلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۸

۷۔ ایضاً، ص ۳۷

۸۔ محبوب ظفر، احمد فراز فن و شخصیت، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، اشاعت دوم، ۲۰۱۶ء، ص ۱۵۲

۹۔ غلام شبیر رانا، ڈاکٹر، احمد فراز مشمولہ احساس ۲، ملاقات پہلی کیشنز پشاور، ص ۸۱

۱۰۔ فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری، دوست پہلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۳۲

۱۱۔ کشور ناہید، بحوالہ ندیم لیل، یہ اور بات مری زندگی وفانہ کرے، مشمولہ کتاب احمد فراز نمبر، نیشنل بک

فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۱، اکتوبر ۲۰۰۸ تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۳۰۵

۱۲۔ ناصر زیدی، فراز جیسا کوئی نکتہ دان نہیں ملتا، مشمولہ کتاب احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد

۴۰، ۴۱، اکتوبر ۲۰۰۸ تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۳۰۰

۱۳۔ فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری، دوست پہلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۲۰

۱۴۔ پرتور و ہیلہ، شہر سخن آراستہ ہے کے چند امتیازات، مشمولہ کتاب احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن

لاہور، جلد ۴۰، ۴۱، اکتوبر ۲۰۰۸ تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۷۸

۱۵۔ قرآن مجید، مترجم محسن علی نجفی، سورہ مائدہ، آیت: ۳۲، دار القرآن الکریم جامعۃ الکواثر اسلام آباد، طبع ہفتم،

۲۰۱۶ء، ص ۱۵۳

- ۱۶۔ خالد سہیل، ڈاکٹر، شہر آشوب کا تنہا مسافر، مشمولہ احمد فراز شخصیت و فن، زیتون بانو تاج سعید، مرتبین، دوست پبلیکیشنز اسلام آباد، س ن، ص ۲۷۶
- ۱۷۔ عباس عالم پاکستان میں جمہوریت پر کیا گزری، ر میل ہاوس آف پبلیکیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۵۱
- ۱۸۔ خالد سہیل، ڈاکٹر، شہر آشوب کا تنہا مسافر، مشمولہ احمد فراز شخصیت و فن، زیتون بانو تاج سعید، مرتبین، دوست پبلیکیشنز اسلام آباد، س ن، ص ۲۷۵
- ۱۹۔ ثاقب رزمی، احمد فراز اور غم دوران، مشمولہ احمد فراز شخصیت و فن، زیتون بانو تاج سعید، مرتبین، دوست پبلیکیشنز اسلام آباد، س ن، ص ۶۷
- ۲۰۔ ایضاً، ص ۹۱
- ۲۱۔ منشا یاد، فراز کی خوش بیابیاں، مشمولہ کتاب احمد فراز نمبر، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۱، اکتوبر ۲۰۰۸ تا اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۲۷۴

باب پنجم:

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ

عموماً مزاحمت کا لفظ سننے ہی مخصوص فکر، سوچ، رسم و روایات، ظلم اور ظالم کے خلاف بغاوت ذہن میں آتی ہے۔ مزاحمت مفہوم اور منطوق دونوں پہلوؤں سے بغاوت و مخالفت پر مشتمل ہوتی ہے۔ مخالف سوچ اور ظالم و جابر حکمران سے اختلاف کی بنیاد پر ان کی مذمت، مظلوم کی حمایت، ظالم کی مخالفت اور بالواسطہ طور پر باطل قوتوں کی مخالفت کو مزاحمت کا نام دیا جاتا ہے۔

فطری طور پر تخلیق کار آزاد اور خود مختار ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے حالات سے اثر قبول کرتا ہے اور اپنی فطری صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے انسان کے فطری حقوق سلب کرنے والوں کے خلاف لکھتا ہے۔ تخلیق کار بصیرت کا حامل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ انسانیت کے اصولوں، رسومات و روایات کے رکھوالوں کی حمایت جبکہ فطری تقاضوں اور اصولوں کو نظر انداز کر کے انہیں پاؤں تلے روندنے والوں کی مذمت کرتا ہے۔ مزاحمت کار غیر فطری اصولوں اور انسان دشمن نظریے کو معاشرے کے لیے زہر قاتل قرار دیتے ہوئے لوگوں کو اس مسموم راہ کو مسدود کرنے پر ابھارتا ہے۔

تاریخ عالم پر غور و فکر سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ایک مہذب ملک و قوم اور سماج کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہاں بسنے والے باشندے اخلاقی قدروں کے اوج پر نظر آتے ہیں۔ لوگ اپنی ذات سے بالاتر ہو کر انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی کو فوقیت دیتے ہیں۔ معاشرے میں فکری، معاشرتی اور مذہبی آزادی پائی جاتی ہے اور کسی بھی قسم کی منافرت کی مخالفت کی جاتی ہے۔ جب ایک مہذب قوم و معاشرے کا موازنہ کسی غیر ترقی یافتہ قوم و معاشرے سے کیا جائے تو وہاں پر نفسا نفسی، اقربا پروری اور اپنی بالادستی قائم کرنے کی خاطر ایک دوسرے کو گزند پہنچانے کے لیے تاک میں بیٹھے ہوئے لوگ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک مزاحمت کار سماج میں پائے جانے والے منفی رویے، رجحان اور سوچ کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ وہ اس تفاوت کو بیان کرتے ہوئے معاشرے میں مذموم عزائم رکھنے والوں کی مذمت کرتے ہوئے انسانی بھلائی کا رجحان رکھنے والوں کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔

مزاحمتی ادب کی تخلیق سے ظالم و جابر حکمران اور معاشرے میں موجود انسان دشمن عناصر خائف ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل میں بھی پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ ہمیشہ اپنی مخالفت میں اٹھنے والی آوازوں کو خاموش کرانے کے درپے ہوتے ہیں۔ اشرافیہ، جاگیردار اور حکمرانوں کی مخالفت و مذمت کرنے کے لیے قلم اور آواز بلند کرتے ہی مزاحمت کار کی ان عناصر سے جنگ کی ابتدا ہوتی ہے۔

جاگیردار و حکمران طبقہ ظلم و بربریت کو دولت اور طاقت کے بل بوتے پر چھپانا چاہتے ہیں۔ لیکن مزاحمت کار ان کی دھمکیوں سے بے نیاز ہو کر انسانی صورت میں موجود ان بھیڑیوں کے مذموم کردار و عمل سے پردہ اٹھا کر ان کی حقیقت دنیا کو دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب کی بنیاد ہوتی ہی مزاحمت پر ہے۔ حقیقی مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والوں کا شیوہ یہ رہا ہے کہ وہ کسی سے خائف و مرعوب ہوئے بغیر معاشرے کے نشیب و فراز کا تذکرہ کرتے ہیں اور سماج میں موجود ظلم و استبداد اور ناہمواریوں سے بغاوت کر کے مہذب اور انسانی اقدار اور رویوں کی حمایت کا اعلان کرتے ہیں۔

مزاحمتی ادب کے بارے میں دو خیال پائے جاتے ہیں پہلا یہ کہ مزاحمتی ادب میں ادبی رنگ کم اور سیاسی مقاصد و فکر کی حمایت کا رنگ زیادہ پایا جاتا ہے۔ نیز مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والا چونکہ علمی اور معلوماتی مواد سے تہی دست ہوتا ہے اس لیے وہ اسی رنگ کی وساطت سے اپنی بے مائیگی اور کم علمی کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ عموماً مزاحمتی ادب کے تخلیق کاروں کے ہاں سیاسی جانبداری پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ مرعوب ہونے کی بنا پر رمز و کنایہ میں بات کرتے ہیں اور ان کی اکثریت مصلحت کا شکار رہتی ہے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ مزاحمت کار ادب اور مزاحمت کے امتزاج کے ساتھ تمام خطرات سے ماوری ہو کر معاشرے کی ترقی اور ادب برائے زندگی کو اپنا نظریہ سمجھتے ہوئے لکھتا ہے۔

مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والا اپنی ذات کی فکر سے بالاتر ہو کر ہر درست موقف و اصول کی حمایت اور منفی عمل اور فعل کی مخالفت کرتا رہتا ہے۔ حقیقی تخلیق کار کی پہچان اس وقت ممکن ہوتی ہے جب کسی آزمائش سے گزرنے، ثابت قدم رہنے اور نبرد آزما ہونے کا موقع آن پہنچے۔ آزمائش کے وقت ظاہری طور پر نعرے لگانے اور آواز بلند کرنے والے لغزش پاکی صورت میں جبکہ حقیقی مزاحمت کار نہایت ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ مزاحمت کاروں کے صعوبتوں اور سزاؤں سے گزرنے اور قید و بند کی ہوائیں کھانے کے بعد اگر دیکھا جائے تو حقیقی مزاحمت کار نئے جذبے، احساس اور فکر کے ساتھ نئے انداز میں اعلیٰ

شعری اثاثے لے کر باہر آکر پھر ظالم و جابر کو لٹکارتا ہے جبکہ ظاہری نعرہ زدگان تائب ہو کر نکلتے ہیں اور خاموشی کے پیراہن پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔

احمد فراز رومانویت کی دنیا میں شہرت پانے کے بعد مزاحمت کی دنیا میں بھی مشہور ہوئے۔ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ جابر حکمرانوں کی سختیوں اور مظالم کے باوجود ان کی مخالفت میں جو آوازیں گونجتی رہیں ان میں فیض احمد فیض اور حبیب جالب کی آواز بہت نمایاں تھی۔ ان دونوں کے بعد اگر کوئی آواز سامنے آئی تو وہ احمد فراز کی آواز تھی۔ انہوں نے مزاحمت کی دنیا میں نام کمانے کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی، لوگوں پر کیے جانے والے مظالم پر آمروں کی مخالفت کی، معاشی ناہمواریوں اور ناآسودگیوں نیز جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے رویوں اور پالیسیوں کی مخالفت کی۔ تیسرے مارشل لا کے نفاذ اور اس دور میں قلمکاروں کو دی جانے والی دھمکیوں اور لوگوں پر مختلف حیلوں سے روا رکھنے والے غیر مناسب رویوں کے خلاف انہوں نے قلم سے جہاد کیا۔ غرض اس دور کے اختتام تک ان کی مزاحمت میں شدت دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی شاعری میں قیام پاکستان کے بعد ان خون آشام راتوں اور ظلمتوں کے خلاف مزاحمت پائی جاتی ہے جن کی بدولت بانی پاکستان کی رحلت کے بعد ملک کے سیاسی نظام میں عدم استحکام کا آغاز ہوا۔ فراز نے قائد کے بعد دست درازی کر کے قانون و آئین کو نظر انداز کرنے پھر مارشل لا کی نوبت آنے پر اپنا اصولی موقف بیان کیا اور اس کے مضر اثرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ سیاسی، سماجی اور مذہبی تشدد اور منفی پالیسیوں کے خلاف لکھتے رہے۔ وہ ملک کے لیے ایک آزاد جمہوری حکومت کے قیام کی خواہش لے کر فوت ہو گئے۔ احمد فراز اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ملک کا نظام اور نظم و نسق چلانے کے لیے ایک آزاد جمہوری حکومت کا قیام نہایت ضروری اور اہم ہے کیوں کہ جمہوری حکومت ملک و قوم کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے درجہ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

وہ عالمی سیاست، عالمی ترقی یافتہ ممالک کے رویوں، آمریت اور ملکی سیاست کے غیر آئینی اور غیر انسانی رویوں سے اختلاف کرتے رہے۔ ان کے اختلافی نظریے کے آثار ان کی شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں۔ ان کو ملک میں جمہوری حکومت کے خاتمے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات کے خلاف لکھنے کی پاداش میں کچھ مدت قید و بند کی سزا بھگتنا پڑی۔ پھر انہیں رہا کر دیا گیا۔ انہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ملک میں

رہتے ہوئے لب کشائی کی جائے تو اس سے بھی سخت اور دردناک صورت حال سے گزرنا پڑ سکتا ہے اس لیے وہ خود ساختہ جلا وطنی اختیار کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

یہ بات سچ ہے کہ وہ پردیس میں بھی دیس کی فکر میں رہے اور ملک کے حالات سے باخبر رہ کر دردِ دل کو صفحہ قرطاس پر ثبت کرتے رہے۔ بیرونِ ملک قیام کے دوران دوسرے ممالک کے باغی شعرا سے ان کی ملاقات ہوئی اور ان کی تحریروں اور احساسات سے آگہی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ان باغی شعرا کی نظموں کا ترجمہ کیا۔ ان کی کتاب "سب آوازیں میری ہیں" اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ وہ دو باتوں کا دعویٰ کرتے رہے۔ پہلی یہ کہ جس طرح ان باغی شعرا کے حالات اور زندگیاں سخت ترین انداز میں گزر رہی تھیں اسی طرح میں اور میرا ملک ان دنوں انہی سختیوں سے گزر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ان کی تحریروں کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ دوسرا دعویٰ یہ کیا تھا کہ ان شعرا کی نظموں کا ترجمہ میں نے اپنی صلاحیت کو نکھارنے کے لیے یا جمود وغیرہ سے بچنے کے لیے نہیں کیا بلکہ ان کے اور میرے حالات ایک جیسے تھے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ اپنے اس دعوے میں سچے نظر نہیں آتے۔ وہ دراصل فیض احمد فیض سے بے حد متاثر تھے اور ان کی تبعیت و تقلید میں فراز نے یہ کاوش کی تھی۔ فراز نے ترقی یافتہ ممالک کے تیسری دنیا کے ممالک کے خلاف رویے اور پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے نظمیں لکھی ہیں۔ ترقی یافتہ مالک تیسری دنیا کے ممالک خصوصاً مسلم ممالک مثلاً کویت، عراق، انڈونیشیا حتیٰ کہ کانگو وغیرہ پر بھی مختلف حیلے بہانے سے حملہ کر کے ان کے اثاثوں تیل، اور سونے کے کانوں پر قبضہ کر کے ان پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑتے نظر آتے ہیں۔ فراز نے اس ظلم کی مخالفت کرتے ہوئے مغربی ممالک کی طاقت اور پالیسیوں کو تیسری دنیا کے ممالک خصوصاً ایشیائی ممالک کے لیے خطرہ قرار دیا ہے۔ ان کی شاعری میں مزاحمت صرف ملک میں ہونے والی ناہمواریوں پر ہی مشتمل نہیں بلکہ ان کی شاعری میں عالمی سطح پر بھی مزاحمت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ وہ کسی بھی جگہ انسانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہو کر بلا رنگ و مذہب اور نسل و قوم، مظلوموں کی حمایت میں صدا بلند کرتے رہے۔

آزاد ذہن و خیال کے مالک اور غیر متعصب انسان کا شیوہ اور طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسے کہیں پر بھی کسی ذی روح پر ظلم کے آثار نظر آئیں تو اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ چنانچہ فراز کا عالمی سیاست کی مخالفت و مذمت کرنا بے جا نہیں ہے بلکہ انہوں نے بجا طور پر اصولی موقف رکھتے ہوئے مذمت کی ہے۔ انہوں نے عالمی

سطح پر امن وامان قائم رکھنے کا دعویٰ کرنے اور دکھاوے کے لیے ظاہری طور پر تگ و دو کرنے والوں کی منافقت سے اختلاف کیا ہے۔ امن کے رکھوالوں کا خود ہی مختلف ممالک کو قتل گاہ بنا کر انسانوں کو موت کی وادی میں دھکیل دینے کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے مغربی ممالک، جو کہ اپنی طاقت کے ذریعے ویتنام کو بے گناہ انسانوں کا قبرستان بنانے اور وہاں کے شہریوں کی جانوں سے کھیلنے میں مصروف تھے کو سفاک قاتل قرار دیا ہے۔ انہوں نے امریکہ کی سیاست اور پالیسیوں سے شدید نفرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ امریکہ کی سیاست اور ان کے سیاسی ایوانوں میں دوسرے ممالک کے مفاد و خود مختاری کی بات اور بحث ہونے کے بجائے محض دوسرے ملکوں کا سودا کرنے کی پالیسی مرتب ہوتی ہے۔

انہوں نے ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں پر بھی طنز کیا ہے کہ وہاں کے لوگ دوسرے انسانوں کو قتل کرنے یا کرانے پر خاموش تماشائی بنے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ جب کہ دوسرے لوگ آنسو بہا رہے ہوتے ہیں۔

فراز نے مغربی ممالک کی اسلام دشمنی پر مبنی پالیسی اور مسلم ممالک کی قوت و طاقت کے خلاف ہونے والی سازش کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ مغربی طاقتوں نے سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے پہلے عرب اور عجم کا شوشہ چھوڑا اور بعد میں عرب کے بعض شیوخ کو مسند بادشاہت پر لا کر بٹھادیا۔ ان مسلم دشمن عناصر نے مسلمانوں کی طاقت و قوت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے بہت سرمایہ خرچ کیا۔ ان کے اس غلط اقدام کے حوالے سے فراز نے نظمیں اور اشعار لکھے ہیں۔ ان ممالک کی سازش کی ایک مثال یہ ہے کہ لبنان کی سر زمین میں اسرائیل جو کہ امریکا کی ناجائز اولاد ہے کی حمایت و حفاظت اور مسیحیوں کی بالادستی قائم کرانے کے لیے وہاں کے مسلمانوں کو شیعہ اور سنی میں تقسیم کرا کے زمام اقتدار مسیحی لوگوں کے ہاتھ میں تھادی، مزید برآں یہ کہ لبنان کی گلی کو چپے مسلمانوں کے خون سے رنگین کر دیے۔ اس ظلم کے خلاف بھی فراز نے قلم اٹھایا۔ اس کے علاوہ مغربی ممالک کے مسلمان دشمنی پر مبنی رویوں کے ساتھ شیوخ عرب کی ان کی حمایت اور غلامی میں اپنی گردن جھکانے کی بھی مذمت کی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ایک طرف عالمی سیاست دانوں کی خونی سیاست اور انسانوں کے قتل پر مبنی مکروہ سیاست کی مذمت کی ہے تو دوسری طرف عالمی سطح پر بلا امتیاز اپنی قوم و ملک کی آزادی کی خاطر قربانی دینے والوں اور لوگوں کو خواب غفلت سے جگاتے ہوئے ظالم قوتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ اور حوصلہ پیدا کرنے والوں کو داد بھی دیتے رہے، ان میں فیض احمد فیض، حبیب جالب، نیلسن منڈیلا اور قاضی نذر الاسلام وغیرہ شامل ہیں۔

فراز کا یہ کہنا درست تھا کہ ہمارا ملک نہ جمہوری دور حکومت میں آزاد و خود مختار ہوتا ہے، اور نہ دور آمریت میں۔ قوم ہر دور میں محکوم و مقہور ہوتی ہے کیونکہ دونوں حکومتوں کی ڈور مغربی قوتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس بات کے حوالے سے بہت سے ثبوت و شواہد سیاسی تاریخ میں ملتے ہیں۔ ان کا اس بات سے بھی اختلاف کرنا بجا تھا کہ جس نوعیت کی بھی حکومت قائم ہو عالمی قوتوں کے اشارے پر ناجستی نظر آتی ہے۔ اس کی واضح مثال افغان جہاد کا نعرہ تھا اس پر آئی آگ میں ہمارے لوگ ایسے کود پڑے کہ وہ آگ ہمارے ملک تک آپہنچی جو ابھی تک فرو برد نہیں ہوئی۔

آمریت سے اختلاف کا نعرہ ان کی شاعری کا حصہ رہا ہے خاص طور پر تیسرے مارشل لا کے نفاذ سے انجام کار تک کے دوران ان کی شاعری میں مزاحمت کی شدت دیکھی جاسکتی ہے۔ اس دور میں جب دوسرے لوگ مرعوب ہوتے ہوئے محتاط انداز میں لکھ رہے تھے احمد فراز صدائے احتجاج بلند کرتے رہے۔ ان کی بعض نظموں کی کیفیت دیکھ کر ان کے باغی ہونے کا گمان ہوتا ہے ساتھ میں کہیں لغزش پاکی روایت بھی ملتی ہے۔ یہ بات قابل تحقیق ہے کہ ان کی مزاحمت میں سیاسی جانب داری کا پہلو ہے یا نہیں۔

ان کا سیاست دانوں سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن در پردہ وہ جانب داری کا رجحان رکھتے تھے۔ ان کی مزاحمتی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلے حصے میں کسی جانب داری وغیرہ کا شائبہ نہیں پایا جاتا اور یہ سلسلہ قیام پاکستان سے یحییٰ خان کی حکومت تک پر مشتمل ہے۔ اس دوران انہوں نے قائد اعظم کی رحلت کے بعد مسند کے خواہش مند کی مذموم سازشوں کے اثرات اور ان کے نتائج کے خلاف لکھا ہے۔ تحریک پاکستان سے لے کر قیام پاکستان تک قائد کے شانہ بشانہ کام کرنے، ہجرت کی صعوبتوں کو برداشت کر کے خون کی ندیاں عبور کرتے ہوئے آنے والے سرفروشن کو دیوار سے لگانے والے سازشی عناصر کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ دوسرا حصہ جانب داری پر مشتمل ہے۔

انہوں نے اپنی شاعری میں ملک میں پائی جانے والی سیاسی ریشہ دوانیوں کی بھی مذمت کی ہے۔ ان کا یہ موقف درست ہے کہ آمریت کو اقتدار تک رسائی دلانے اور آمریت کے ہاتھ کو مضبوط کرانے میں سیاست دانوں کا اہم کردار رہا ہے۔ اسی لیے وہ جمہوریت کا نعرہ بلند کرتے ہوئے جمہوریت کے اصولوں کو پاؤں تلے روندنے والے سیاست دانوں کو ملک و قوم کے مفاد کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ ان کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ ملک کی سیاست میں موجود سیاسی پارٹیوں اور مذہبی جماعتوں میں بڑی منافقت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے سیاست

دانوں اور مذہبی رہنماؤں کے بزدلانہ اور غیر دانشمندانہ اقدامات کی مخالفت کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ لوگ گرتی ہوئی آمریت کی صورت حال دیکھ کر بے خوف و خطر ماحول میں انتہائی جوشیلے انداز میں جلسوں اور جلوسوں میں پیش پیش ہو کر دھواں دار تقریریں کرتے ہیں لیکن آمر کے مسند نشین ہوتے ہی بالکل خاموش ہو جاتے ہیں جس کی ایک مثال ایوب خان کے استعفیٰ کا اعلان اور یحییٰ خان کے اقتدار میں آنے کے حالات و واقعات ہیں نیز ضیاء الحق دور میں خاموشی کا طویل زمانہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ احمد فراز نے بھی دوسرے شعر کی طرح ملکی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور ناتلاfi نقصان پہنچانے والی تقسیم جو کہ سقوطِ ڈھاکہ کے نام سے مشہور ہے کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی نظمیں جو سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر مشتمل ہیں، ان میں فراز آمریت کو اس سانحے کا زیادہ قصور وار ٹھہراتے نظر آتے ہیں۔ سیاست دانوں کا اگر ذکر کیا ہے تو آمریت کی نسبت کم شدت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بظاہر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ فوج کے خلاف نہیں بلکہ مطلق العنان آمریت کے خلاف ہیں۔ آمریت اور فوج کے بارے میں ان کے بیانات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ان کی بعض باتوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ملک میں طاقتور ترین ادارہ فوج ہے لہذا وہ خود تو نہیں مگر اپنی اولاد کو اس طاقت کی صف میں کھڑا دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے جس کی مثال ان کے بیٹے کا آرمی میں کمیشن اختیار کرنا ہے۔

انہوں نے ملک کے عوام کی عزت و وقار اور حقوق سلب کرنے والے استحصالی گروہ سے شدید اختلاف کیا ہے۔ ان کی یہ رائے بجا ہے کہ عوام کی عزت و حقوق سلب کرنے والوں میں سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقہ پہلے نمبر پر جبکہ حکمران طبقہ دوسرے نمبر پر ہے۔ انہوں نے ملک کو غربت کی انتہا تک پہنچانے کا ذمہ دار انہی جاگیر دار طبقوں کو ٹھہرایا ہے۔ ملک میں یہ صورت حال اب بھی ہے۔ مال دار معاشرے کے غریب لوگوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کی یہ سوچ و فکر تسلسل کے ساتھ جاری ہے کیونکہ ان کی اولاد کی پرورش اور تربیت اسی ماحول اور سوچ کے مطابق ہو رہی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس مکروہ عمل میں ان کی اولاد اپنے والدین سے کافی آگے چلتی نظر آتی ہے اور لوگوں کی عزت و احترام کا خیال خاطر میں نہیں لاتی۔ ان کو غریبوں کی ضروریات زندگی کی خبر تک نہیں ہوتی۔ جمہوری حکومت کے قیام کے ساتھ ملک میں پائے جانے والے سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام جیسے فرسودہ نظاموں کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ایوان میں بیٹھے ہوئے سیاست دان چند سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کی غلامی کرتے اور ان سے وفاداری نبھاتے ہوئے ایسے کام کرتے ہیں جو عوام

کے لیے نقصان دہ اور آقاؤں کے لیے زیادہ فائدہ مند ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایسے سیاست دانوں کی مذمت کی ہے۔ ایسے سیاست دانوں کے دل میں عوام کا دکھ درد اور احساس بالکل بھی نہیں ہوتا۔ انہوں نے اس بات پر سخت اور شدید احتجاج کیا ہے کہ ہمارا ملک زرعی اور معدنی وسائل سے مالا مال ہوتے ہوئے بھی اتنی غربت کیوں ہے؟ وہ اس بات پر بھی چیختے رہے کہ غریب خون پسینہ ایک کر کے بعد بھی دو وقت کی روٹی کے لیے ترستے نظر آتے ہیں۔ نیز فراز نے کھیتوں میں کڑی دھوپ میں جان کی بازی لگا کر محنت کرنے والے ہاریوں کو اجرت سے محروم کر کے راتوں رات جائیداد بنانے والوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ وہ غریب طبقے کی اس آہ پر تڑپتے نظر آتے ہیں جو مجبوریوں تلے دب کر بے ساختہ کہتے ہیں کہ "ان امیروں کو ہماری مجبوریوں کا علم نہیں۔"

فراز نے ملک تقسیم کرنے اور عوامی حقوق سلب کرنے والوں کی مخالفت کی ہے۔ یہ بات حق پر مبنی ہے کہ جیسے عوام ویسے ہی حکمران۔ فراز نے آمروں کی آئین شکنی اور ظلم کا دروازہ وا ہونے میں عوام کی مجرمانہ خاموشی کو ایک بڑی وجہ قرار دیا ہے اور عوام کی حکمرانوں کے حکم کو من و عن تسلیم کرنے کے طریقے کی مخالفت بھی کی ہے۔ انہوں نے ظلم سہتے ہوئے خاموش بیٹھنے والوں کو چلتی پھرتی لاش سے تعبیر کیا ہے۔ کسی بھی جگہ اور کسی بھی قوم کی رسم و روایات کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن فراز نے اپنی قوم اور قبائل کی رسم و روایات کی مخالفت کی اور جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان رسومات کو ماننے سے انکار کیا۔ انہوں نے نہ صرف خود ان رسومات سے انکار کیا ہے بلکہ وہ دوسروں کو بھی بغاوت کرنے پر اکساتے رہے۔

ان کی شاعری میں منصفوں کے خود ہی انصاف کا خون کرنے اور آئین و قانون کو پاؤں تلے روندنے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہماری عدالتی تاریخ میں ایک دو منصفوں کے علاوہ اکثریت کا جھکاؤ ہمیشہ قانون شکنوں کی جانب رہا ہے۔ پاکستان کی عدالتی تاریخ میں نظریہ ضرورت نے انصاف کی بنیاد کو خراب کر دیا۔

فراز نے صنفی اختلافات کی بنیاد پر صنفِ نازک پر کیے جانے والے مظالم کی مخالفت کی ہے۔ قدیم تاریخ کی روشنی میں اس طرح کے مظالم کے تسلسل کا ذکر بھی کیا ہے لیکن خود ان کی اپنی زندگی میں صنفِ نازک کے تقدس و حرمت یا خواتین کے بارے میں رکھی جانے والی آرا کے بارے میں سب جانتے تھے۔ بعض رفیق کاروں نے ان کی نیت کے بارے میں اپنی منفی رائے دی ہے۔

فراز نے نعت و سلام لکھتے ہوئے بھی احتجاجی رنگ برقرار رکھا ہے اور سانحہ کربلا کو ایک قابل تقلید تحریک اور باطل شکن معرکہ قرار دیا ہے۔ ظالموں کے مقابل کھڑا ہونے، حق کی سر بلندی اور باطل کو ملیا میٹ کرنے کے لیے حسینی فکر و فلسفہ کو اپنانے جبکہ یزیدی فکر و سوچ کو چھوڑنے پر زور دیا ہے۔ وہ مذہبی رہنماؤں کے خلاف بھی مزاحمت و احتجاج کرتے رہے۔ انہوں نے مفتیانِ دین کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ لوگ مراعات کے حصول اور جزوقتی عزت و مقام کی خاطر عوام کے مذہبی جذبات کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ ان کی یہ بات کسی حد تک درست ہے انہوں نے ملا وغیرہ پر زیادہ تنقید کی ہے۔ نیم خواندہ ملا ذاتی طور پر علمی و فکری صلاحیتوں سے عاری ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی معاشرے کو جنت اور پر سکون بنانے کے بجائے بد امنی پھیلانے اور جہنم بنانے میں مصروف نظر آتا ہے۔ فراز اسلام کے اعلیٰ اصولوں اور فلسفہء اسلام کو چھوڑ کر اپنی سوچ کو اسلامی رنگ دینے کے لیے آیات اور احادیث کی غلط تفسیر و تشریح کرنے والے مفتیانِ دین سے اختلاف کرتے ہوئے اس طبقے کے لوگوں کے خلاف بولتے رہے۔ انہوں نے لالچ اور منصب و مراعات کے لیے ظالم حکمرانوں سے ربط و تعلق قائم رکھنے والوں کی مذمت کی ہے۔ درباروں اور ایوانوں میں ظالموں کی حمایت کرنے، ان کی صف میں بیٹھنے کی خواہش رکھنے کو اسلام مخالفت تصور کرتے ہوئے ان پر مذہبی استحصال کرنے کا الزام لگایا ہے۔ انہوں نے مذہبی طبقے کی روش، مذہب کے نام پر استحصال کرنے اور غلط تعبیرات پیش کرنے کی مذمت و مخالفت کی ہے۔ حکومت میں شامل مذہبی افراد میں سے بعض کے ساتھ ذاتی عناد وغیرہ کی بنیاد پر بھی وہ مذہبی طبقوں کی مخالفت کرتے رہے۔ مذہبی طبقے کی مذمت و مخالفت کے حوالے سے ان کے قول و کردار میں فرق نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں دو صورتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ انہوں نے مذہبی لوگوں کی مذمت کی ہے اور وہ مذہبی لوگوں سے خائف بھی رہے۔ دوسری صورت یہ کہ وہ ان لوگوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اس مقام پر پہلی صورت کو ترجیح دینا مناسب ہے۔ ان کی زندگی کے حالات و واقعات کو غور سے پڑھنے کے بعد اس بات کے کئی ثبوت ملتے ہیں، جبکہ دوسری صورت کا امکان بہت کم ہے کیونکہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے رسم و روایات سے منحرف نظر آتے ہیں۔

ب۔ نتائج

زیر نظر تحقیق سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

- 1۔ احمد فراز کی شاعری میں مزاحمت ایک بنیادی رویے کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے جس کی نمایاں جہات سیاسی، سماجی اور مذہبی ہیں۔
- 2۔ مزاحمت کی سیاسی جہت کے ضمن میں احمد فراز نے اپنی شاعری میں عالمی اور مقامی سیاست کے اجارہ داروں کی چیرہ دستیوں اور فریب کاریوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ انھوں نے مضبوط آواز کے ساتھ ان قوتوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے جو ظلم و جبر کے نظام کے پس پردہ کار فرما ہیں۔
- 3۔ مزاحمت کی سماجی جہت میں احمد فراز کی شاعری سماج کی ان مختلف قوتوں کے خلاف احتجاجی لے پر مشتمل ہے جو پسے ہوئے، پس ماندہ اور مظلوم طبقوں کے سماجی و معاشی استحصال میں مصروف ہیں۔ معاشرے میں نا انصافی، طبقاتی کشمکش اور دیگر سماجی مسائل پر شاعر کا نقطہ نظر بے باکی سے سامنے آیا ہے۔
- 4۔ مزاحمت کی مذہبی جہت ان قوتوں کے خلاف ہے جو خدائے منصف کا نام لے کر نا انصافی کا بازار گرم کرتی ہیں۔ ان کی مزاحمت مذہب کے خلاف نہیں بلکہ مذہب کے اس تصور کے خلاف ہے جو مذہب کی روح کے منافی ہے۔
- 5۔ احمد فراز کی نظم اور غزل دونوں اصناف میں مزاحمت کا رویہ یکساں قوت کے ساتھ ابھرتا ہے۔
- 6۔ اپنے فکری معاملات کی بے باکانہ پیشکش میں احمد فراز نے ادب کی جمالیاتی اقدار پر سمجھوتا نہیں کیا۔ جہاں ان کے شعری افکار کی ترسیل و اظہار مؤثر ہے وہیں ان کی شاعری کے فنی اور جمالیاتی تقاضے بھی مجروح نہیں ہوئے۔

ج۔ سفارشات

اسی تحقیق کی روشنی میں چند سفارشات بھی پیش ہیں:

- 1۔ زیرِ نظر تحقیق احمد فراز کی شاعری میں مزاحمتی رجحان کے مطالعے پر مبنی ہے، ایسے ہی مطالعات ان کے دیگر معاصرین کے بھی ہونے چاہئیں تاکہ بعد ازاں تقابلی مطالعے کی ایک صورت پیدا ہو اور اس عہد کی مزاحمتی شاعری کا مجموعی تاثر سامنے آ سکے۔
- 2۔ دنیا اور پاکستان کی دیگر زبانوں میں ہونے والی مزاحمتی شاعری کا احمد فراز کی شاعری سے تقابل بھی ایک اچھے تحقیقی مطالعے کا موضوع ہو سکتا ہے۔
- 3۔ جامعات کے نصاب میں مزاحمتی ادب کو ایک الگ موضوع کے طور پر پڑھایا جانا چاہیے کیونکہ یہ ادب کی ایسی جہت ہے جس کا براہِ راست تعلق انسانی زندگی کے خارجی معاملات اور سماجی انصاف کے ساتھ ہے۔

کتابیات

الف۔ بنیادی مآخذ:

- احمد فراز، اے عشق جنوں پیشہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
 احمد فراز، پس اندازِ موسم، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ۱۹۹۴ء
 احمد فراز، تنہا تنہا، یوسف پبلشرز راولپنڈی، س ن
 احمد فراز، جاناں جاناں، تنویر پریس لکھنؤ، ۱۰۷۹ء
 احمد فراز، خواب گل پریشاں ہے، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۱۹۹۴ء
 احمد فراز، درد آشوب، یوسف پبلشرز راولپنڈی، س ن
 احمد فراز، شب خون، کاک پرنٹرس دہلی، ۲۰۰۲ء
 احمد فراز، شہر سخن آراستہ ہے، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۱۶ء
 احمد فراز، غزل بہانہ کروں، کاک پرنٹرس دہلی، ۲۰۰۲ء
 احمد فراز، نایافت، کاک پرنٹرس دہلی، ۲۰۰۲ء
 احمد فراز، نابینا شہر میں آئینہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ۱۹۹۴ء

ب۔ ثانوی مآخذ:

i. کتب

- آغا سہیل، ڈاکٹر، ادب اور عصری حسیت، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۱ء
 ابوالفضل مولانا عبد الحفیظ، مکتبہ برہان نئی دہلی، ۱۹۹۵ء
 احمد سلیم، اسمبلیاں، احتساب اور عدلیہ، سارنگ پبلشرز لاہور، س ن
 احمد سلیم، مہاجر قومی موومنٹ تشکیل اور جدوجہد، سارنگ پبلشرز لاہور، س ن
 اشفاق حسین، احمد فراز یادوں کا ایک سنہری ورق، وجدان پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۹ء
 امیر عبد اللہ خان روکڑی، میں اور میرا پاکستان جنگ پبلشرز، س ن
 اے حمید، امر تسر کی یادیں، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۱ء
 جاوید اختر پاشا، تعلقات عامہ۔ انقلاب آفریں، الہلال پبلشرز اسلام آباد، ۱۹۹۴ء

خالد کاشمیری، جنرل ضیا کے سیاسی تضادات، عکس جہاں پہلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵ء
 روبینہ شہناز، ڈاکٹر، اردو تنقید میں پاکستانی تصور قومیت، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
 رضی عابدی، تیسری دنیا کا ادب، مکتبہ فکر و دانش لاہور، س ن
 رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
 رشید امجد، مرتب، مزاحمتی ادب اردو، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
 زیتون بانو۔ تاج سعید، مرتبین، احمد فراز شخصیت و فن دوست پہلی کیشنز اسلام آباد، س ن
 زاہدہ جبین، مرتبہ، وہ جو شہر سخن تھا، گوہر پہلی کیشنز، لاہور، س ن
 ستار طاہر، جنرل ضیاء الحق ایک آدمی۔ ایک ڈکٹیٹر، کلاسیک لاہور، س ن
 سید محمد مظفر، ڈکٹیٹر کون؟، اردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور، ۱۹۷۵ء
 سہیل وڑائچ، جرنیلوں کی سیاست، ساگر پبلشرز لاہور، س ن
 سہیل وڑائچ، عدلیہ کے عروج و زوال ساگر پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء
 سید محمد ابوالخیر کشفی، اردو کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۷ء
 سجاد حارث، ادب اور ریڈیکل جدیدیت، شرکت پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۸۸ء
 شاہد حسین رزاقی، تاریخ جمہوریت، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۱۶ء
 شاہد ندیر جوہری، امریکی مارشل لا، علی میاں پہلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء
 شریف فاروقی، مادرِ ملت۔ سرمایہ ملت، وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان اسلام آباد، اشاعت اول،
 ۲۰۰۳ء

صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان تاریخ و سیاست، جنگ پبلشرز، اشاعت چہارم، ۱۹۹۲ء
 طارق مجید، عالمی طاغوتی کھیل میں مکروفریب کارج، گلوبل گیم ایکسپوٹر سینٹر لاہور، ۲۰۰۳ء
 علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، طبع دوازدہم، ۲۰۱۸ء
 عبداللہ طارق، سی آئی اے کی خفیہ جنگیں، نگارشات پبلشرز لاہور، ۲۰۰۴ء
 عالم عباس، پاکستان میں جمہوریت پر کیا گزری، رمیل ہاوس آف پبلیکیشنز، ۲۰۰۶ء
 عشرت ظفر، شاخ نہال غم (احمد فراز فن و شخصیت)، جگر اکیڈمی کانپور، ۲۰۰۹ء
 فتح محمد ملک، پروفیسر، تحسین و تردید، اثبات پہلی کیشنز راولپنڈی، ۱۹۸۴ء

فتح محمد ملک، احمد فراز کی شاعری، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
 قمر رئیس، ڈاکٹر، تعبیر و تحلیل، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۶ء
 قاسم یعقوب، اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء
 کوثر نیازی، اقبال اور تیسری دینا، المنار بک سنٹر لاہور، ۱۹۸۱ء
 گوہر ایوب، ایوان اقتدار کے مشاہدات، سنگ میل لاہور، ۲۰۰۷ء
 مرزا اسد اللہ خان غالب۔ دیوان غالب فیروز سنز لاہور، بار اول، ۱۹۸۹ء
 محبوب ظفر، احمد فراز فن و شخصیت، اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت دوم، ۲۰۱۶ء
 منیر احمد، جرنیل شاہی، زاہد بشیر پرنٹرز لاہور، ۱۹۹۴ء
 محمد یحییٰ خان، امریکی مکاریوں کی تاریخ، نگارشات پبلشرز لاہور ۲۰۰۹ء
 مسعود الحسن، پاکستان میں مارشل لا کی حکومتیں، ادارہ کاروان ادب، لندن، ۲۰۰۱ء
 محمد فاروق قریشی، پاکستان جمہوریت کا زوال، مکتبہ فکر و دانش لاہور ۱۹۹۱ء
 مجاہد حسین، پاکستان کے متنازعہ سیاستدان، تخلیقات لاہور، ۱۹۹۷ء
 مبارک علی، ڈاکٹر، جاگیر داری، فکشن ہاؤس لاہور، ۱۹۹۶ء
 مبارک علی، ڈاکٹر، جاگیر داری اور جاگیر داری کلچر، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۹۶ء
 مولانا گوہر رحمانی، اسلامی سیاست، المنار بک سنٹر لاہور، ۱۹۸۱ء
 وسیم گوہر، کیا پاکستان بھٹو نے توڑا، سارنگ پبلشرز لاہور، ۲۰۰۶ء
 وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ جدید اردو و غزل، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد طبع اول، ۱۹۸۸ء
 وکیل محمد انجم، سیاست کے فرعون، فیروز سنز لاہور، سن

ii. رسائل و اخبارات:

احساس ۲ ملاقات پبلی کیشنز پشاور، ۲۰۱۲ء
 اخبار اردو اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۸ء
 ادبیات، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
 اقدار کراچی شمارہ ۱۵، ۱۶ جلد ۷، ۲۰۰۳ء
 تخلیقی ادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، شمارہ ۷، جون ۲۰۱۰ء

چهار سُر اور لپنڈی، شمارہ ۳۰، ۳۱، جلد ۳، جنوری فروری ۱۹۹۵ء
 رجحانات، گور اپبلشرز لاہور، جولائی-دسمبر، ۱۹۹۴ء
 روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۲ نومبر ۱۹۷۰ء
 روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۱۴ اپریل ۱۹۷۰ء
 قومی زبان کراچی، شمارہ ۸۱، مارچ ۲۰۰۹ء
 کتاب، اسلام آباد، بیاد احمد فراز نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، جلد ۴۰، ۴۱، اکتوبر ۲۰۰۸ تا اپریل ۲۰۰۹ء
 ماہنامہ عوامی منشور کراچی شمارہ ۸ جلد ۱۲ نومبر ۲۰۰۷ء
 ماہنامہ احمد فراز نمبر ادارہ مطبوعات پاکستان لاہور، شمارہ ۹ جلد ۲۱، جنوری ۲۰۰۹ء
 ہفت روزہ عزم، لاہور، شمارہ ۲۹، جلد ۲۲، ۲۰ تا ۲۰ اگست ۲۰۱۱ء

iii. لغات / فرہنگ

مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ جلد سوم، چہارم، اردو سائنس بورڈ لاہور، طبع پنجم، ۲۰۰۶
 مہذب لکھنوی، مہذب اللغات، جلد سیزدہم، نامی پریس دہلی، سن
 لوئیس معلوف، مصباح اللغات، عبداللہ اکیڈمی لاہور، آر آر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۲۰

iv. انٹرویو:

افتخار عارف، (انٹرویو) از محمد رضا، اسلام آباد، ۲۶ اپریل ۲۰۱۹ء بہ مقام ادارہ فروغ اردو اسلام آباد، بوقت ۲ بجے،
 بروز جمعہ

v. ویب گاہیں

www.bbc.com، ۲۳ دسمبر ۲۰۱۸ء بوقت ۴:۰۰pm
 www.deedbanmagazine.net، ۵ نومبر ۲۰۱۸ء، بوقت ۳:۰۰pm
 www.humsub.com.pk، ۲۷ دسمبر ۲۰۰۸ء، بوقت ۱۰:۰۰am
 www.urdu-sub.com، ۱۰ دسمبر ۲۰۱۸ء، بوقت ۸:۰۰pm